اشرف شاد

فن، شخصیت، انٹرویوز، تحریریں

ترتیب و تدوین: جی۔ این۔ قریشی
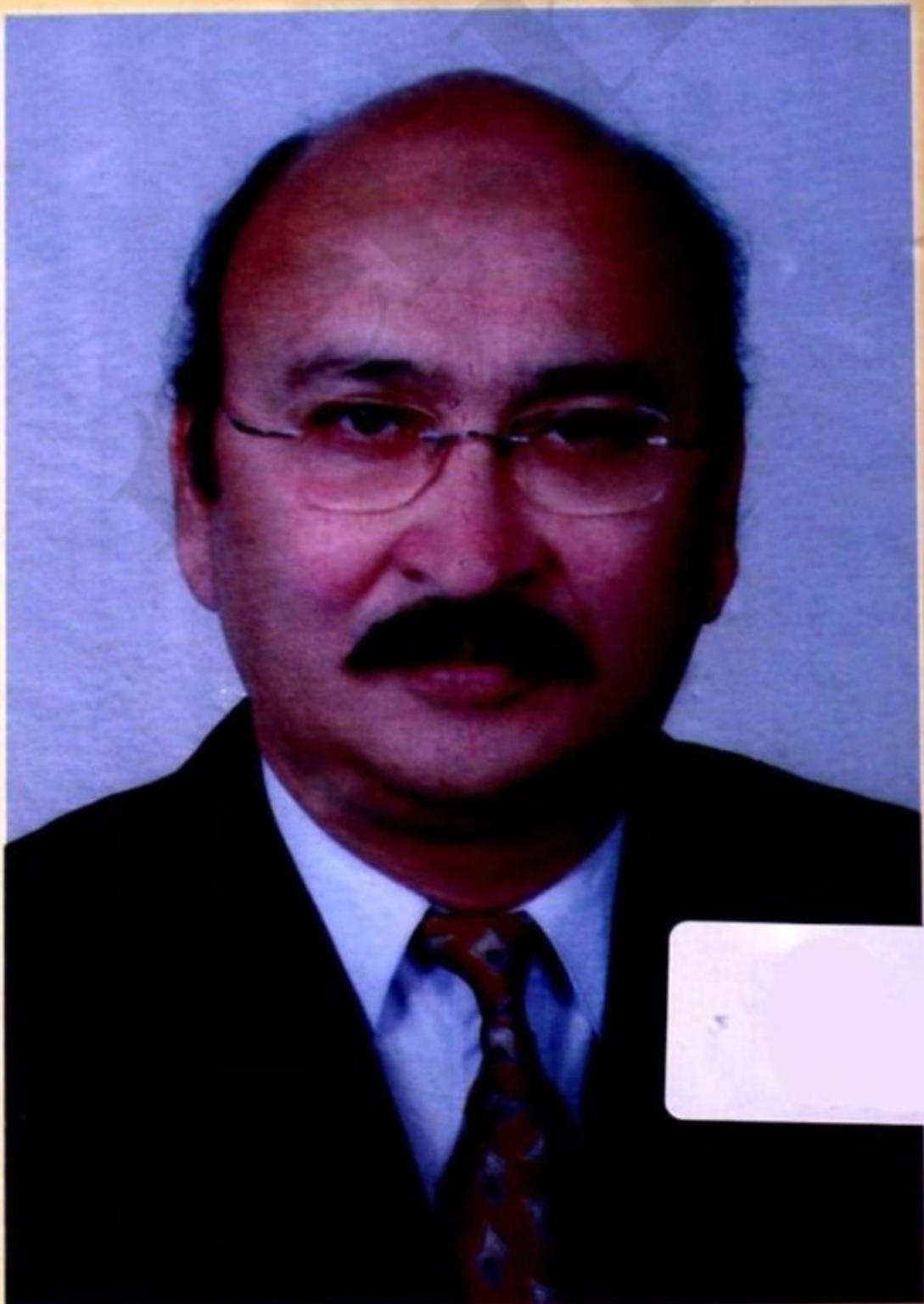
اشرف شاد

فن، شخصیت، انٹرویوز

ترتیب وتدوین:

جی۔این۔قریشی

پاکستانی ادب پبلی کیشنز

عقابی

انتساب

سچ لکھنے والوں کے نام

ضابطہ:

نام کتاب: اشرف شاؔد
ترتیب وتدوین: جی این قریشی
کمپوزنگ: حیاءالدین
مطبع: پاکستانی ادب پبلی کیشنز
225/1, Panorama Centre
Fatima Jinnah Road, Saddar, Karachi.
Ph: 021-35220793

سنہ اشاعت: ستمبر ۲۰۱۳ء
تعداد: ایک ہزار
قیمت: ۳۵۰ روپے (پاکستانی)، ۱۵ ڈالر (آسٹریلیا)

رابطہ: اشرف شاؔد
208/99, Jones Street
Ultimo, Sydney NSW 2007
Australia.
Ph: Australia: +61(0)431029388
Ph: Pakistan: +92(0)3332407498
e mail: ashrafshad@hotmail.com

ترتیب

پیش لفظ	جی این قریشی	۹
ادب میں سیاسی موضوعات	احمد ندیم قاسمی (مرحوم)	۱۴
قصۂ سپہ گری	اشرف شاد	۱۵
باخبری اور باضمیری	پیرزادہ قاسم صدیقی	۲۰
سوانحی خاکہ	اشرف شاد	۲۱
تخلیق کا فن اور بات کرنے کا ڈھنگ	شوکت صدیقی (مرحوم)	۲۴

تبصرے

انصاف گریز معاشرہ اور 'جج صاحب' کا انتظار	امجد اسلام امجد	۲۷
اشرف شاد کے ناول	منشا یاد	۳۰
بحر سے تال تک	منشا یاد	۳۱
وسیع مشاہدہ، وقیع لہجہ اور شجیع اسلوب نگاری	محمود شام	۳۷
زبان و بیان کی سلاست، روانی اور شگفتگی	شکیل عادل زادہ	۴۰
اشرف شاد کا ناول 'وزیر اعظم'	پروفیسر نذیر احمد	۴۱
ابدی صداقتوں کی زبان	حمایت علی شاعر	۴۶

اشرف شاد کا 'بے وطن'	پروفیسر سحر انصاری	۴۷
جانے پہچانے کردار	عبیداللہ بیگ	۵۲
اشرف شاد کے ناول کا سب سے بڑا سچ	زاہدہ حنا	۵۳
خوش گوار فریضہ	احمد شمسی	۵۸
اشرف شاد: خبر نگاری سے ناول نگاری تک	اطہر ندیم	۵۹
اشرف شاد منفرد لب ولہجہ کا شاعر	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۶۴
اِک پر لہو میں تر	فہمیدہ ریاض	۶۶
سماجی اور سیاسی شعور کی شاعری	شفیع عقیل	۶۹
وزیراعظم، تاریخ کی گواہی	ہرچرن چاؤلہ	۷۲
آئینہ در آئینہ	نقاش کاظمی	۷۳
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں	حسن عابدی	۷۷
اشرف شاد کے بارے میں	جی۔این۔قریشی	۷۹
میرا دوست میرا بھائی......	ارشاد راؤ	۸۱
بے وطن۔عرضِ ناشر	احمد شمسی	۸۳
فطری رومانیت، غنائیت اور ترنم	شمیم زیدی	۸۵
پہلی لکیر: اشرف شاد کا نیا ادبی تحفہ	محمد علی کینبرا	۸۷
ذکر اشرف شاد کا اور بیاں اپنا	ڈاکٹر یاسمین شاد	۸۹
عصری شعور، ترقی پسندانہ سوچ	ڈاکٹر کوثر جمال	۹۲
غزل کا حیران کن موڑ!	عارف رانا	۹۵
اشرف شاد کی کھینچی ہوئی پہلی لکیر	ڈاکٹر نگہت نسیم	۹۷
اشرف شاد کے ادبی سفر کا نیا سنگِ میل	صادق عارف	۱۰۰
اشرف شاد: آسٹریلیا میں ادبی تحریک کے محرک	ڈاکٹر شبیر حیدر	۱۰۳

انٹرویوز

فنکار اب بھی مستور ہے	۱۰۹
ہمارے دانشوروں کا کردار مایوس کن رہا ہے	۱۳۵
سچ لکھنا مشکل ہے، لیکن لکھو تو سچ لکھو	۱۴۳
ہجرت کرنا ہمارا آبائی مشغلہ ہے	۱۴۷
میں ادب میں نظریاتی مباحث سے خود کو الگ رکھتا ہوں	۱۵۳
وطن واپس آ کر کیا کریں؟	۱۵۸
اشرف شاد سے ایک ملاقات	۱۶۱

متفرق تحریریں

کتابوں کے پیش لفظ	اشرف شاد	۱۷۱
نئی دہلی میں چند روز	اشرف شاد	۱۸۱
ایوب خاور	اشرف شاد	۱۸۶
ریاض رفیع کی بولتی تصویریں	اشرف شاد	۱۸۹
نجم الحسن رضوی کی دبئی سے رخصتی پر	اشرف شاد	۱۹۲
ہمہ جہت، ہمہ صفت شمیم زیدی	اشرف شاد	۱۹۷
اشکال سے اشعار تک	اشرف شاد	۲۰۱
ہم کیا ہماری ہجرت کیا	اشرف شاد	۲۰۴
تعارفی تقریب صدرِ محترم	اشرف شاد	۲۰۶
محبت اپنا اپنا تجربہ ہے	اشرف شاد	۲۰۹

کراچی سے کراچی تک

جی این قریشی

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت کا ذکر چھوڑ دیا جائے تو اشرف کا سفر کراچی سے شروع ہوتا ہے اور ایک دائرہ بناتا ہوا پورے گلوب پر گردش کرتا رہتا ہے۔ اس دائرے کا گھیر بہت وسیع ہے اور اس میں کئی چھوٹے بڑے اسٹیشن اور جنکشن آتے ہیں۔ بڈاپسٹ اور ماسکو۔ لاہور، کراچی اور حیدرآباد کی جیلیں اور پھر اچانک اشرف کی گاڑی نیویارک پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے۔ وہاں سے پھر بحرین، کویت اور سڈنی جو اس کا نیا وطن بن جاتا ہے لیکن وہ ایک بار پھر اپنا خیمہ کمر پر لاد کر متحدہ عرب امارات جا پہنچتا ہے اور وہاں سے برونائی دارالسلام۔ اب خبر یہ ہے کہ وہ اپنا دائرہ واپس گھما کر سڈنی جا رہا ہے جسے وہ اپنا گھر کہتا ہے اور جہاں اس کا مکان بھی ہے اور خاندان بھی۔ لیکن جانے کیوں مجھے اب بھی یہ گمان ہے کہ وہ اپنا دائرہ مکمل کر کے کراچی ہی واپس آئے گا۔

کراچی اشرف کی پہلی محبت ہے، اس کی رہائش کہیں بھی ہو رہتا وہ اب بھی کراچی میں ہے۔ کراچی ہی کے خواب دیکھتا ہے۔ ایک دن اچانک ایئرپورٹ سے اس کا فون آئے گا کہ 'میں آ گیا ہوں' اور اس کے بعد وہ اپنے روایتی 'مقاماتِ آہ وفغاں' پر کسی نہ کسی دوست کے ہمراہ نظر آ جائے گا۔ پریس کلب کی دوسری منزل پر، میریٹ کے کافی شاپ یا مجھ جیسے کسی دوست کی اسٹڈی میں۔ کسی دوست کو نہیں لگتا کہ وہ ۳۳ برس پہلے کراچی چھوڑ چکا ہے وہ باتیں بھی سڈنی کی نہیں کراچی کی کرتا ہے، اُس وقت کی جب کراچی واقعی کراچی تھا۔

اشرف سے میرا پچاس سال سے زیادہ عرصے کا ساتھ ہے اس کی زندگی کا کوئی ایسا اہم موڑ

نہیں ہے جس پر ہم ساتھ نہ رہے ہوں۔ سڈنی میں بیٹھ کر جب اُس نے کتابیں لکھنا شروع کیں تو احمد شمسی مرحوم اور میں اس کی کتابوں کے ناشر بن گئے۔ اس کی پہلی دو کتابیں 'نصاب' اور 'بے وطن' ہم نے ہی شائع کی تھیں۔ اب تو اسے ایک اچھا اور باقاعدہ پبلشر میسر ہے، احمد شمسی بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں لیکن اس کتاب کو ترتیب دینے کے لیے میں نے ایک بار پھر نشر و اشاعت سے اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے۔

اشرف کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ شور نہیں مچاتا بس زیرِ لب گفتگو کرتا ہے۔ وہ بڑے سے بڑا کام بھی اتنی خاموشی سے کر گزرتا ہے کہ پتا نہیں چلتا۔ اس ملک میں چند غزلیں کہنے والے ملک الشعراء بننے کے دعوے دار ہوتے ہیں اور ایک آدھ کتاب کا مصنف بن جانے والے اتراتے پھرتے ہیں۔ اشرف ایک درجن کے قریب کتابوں کا مصنف ہو کر بھی نظریں جھکائے رکھتا ہے اور شان دکھانے کی کوشش تو اس نے اس وقت بھی نہیں کی جب اسے اپنے پہلے ہی ناول 'بے وطن' پر بہترین ناول کا وزیر اعظم ادبی ایوارڈ اور خود وزیر اعظم کے ہاتھوں ملا تھا۔ اس کی شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن اسے دوستوں کی محفل میں بھی کسی نے شعر سناتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔

یہ کتاب مرتب کرنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ اشرف کی وہ بہت سی تحریریں جو اس نے کچھ دوستوں کے بارے میں لکھیں، اس کی اپنی کتابوں کے پیش لفظ، اس کی ناول نگاری، افسانہ نویسی اور شاعری پر اساتذہ کے لکھے ہوئے تبصرے، دنیا بھر میں چھپنے والے انٹرویوز اور ایسی ہی بہت سی چیزیں جو ادھر اُدھر بکھری پڑی ہیں ایک جگہ جمع کر دی جائیں۔ اس طرح یہ سرمایہ محفوظ بھی ہو جائے گا اور حال یا مستقبل میں ادبی تاریخ لکھنے والوں کو اشرف شآد کے بارے میں تمام مواد ایک ہی جگہ دستیاب بھی ہو سکے گا۔

اس کام میں اشرف شآد اور یاسمین دونوں نے میری مدد کی ہے۔ ساتھ ہی میرے اور اشرف شآد کے مشترکہ دوستوں نقاش کاظمی، مجاہد بریلوی اور میری اہلیہ پروین قریشی نے اس سلسلے میں گراں قدر مشورے دیے، میں ان کا شکرگزار ہوں۔ کتاب ترتیب دینے کا کام نقاش کاظمی اور مجاہد بریلوی زیادہ احسن طریقے سے کر سکتے تھے لیکن نقاش کاظمی آج کل صحت کے مسائل سے دوچار ہیں اور مجاہد بریلوی جنھیں میں 'مجاہد آن لائن' کہتا ہوں، اپنی نشریاتی ذمے داریاں نباہتے اُڑے اُڑے پھرتے ہیں اور بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔

یاسمین کا تذکرہ کیے بغیر میری بات مکمل نہیں ہوسکتی، بالکل اسی طرح جس طرح یاسمین کے بغیر اشرف کی زندگی نامکمل ہے۔ وہ پروفیسر ڈاکٹر کنیز فاطمہ شاؔد ہو کر سائنس دان کی حیثیت سے دنیا بھر میں معروف ہیں اور دماغی امراض کی ایک اہم محقق ہیں۔ اشرف نے جو بھی کامیابیاں حاصل کی ہیں ان میں یاسمین کا ایک بڑا حصہ ہے۔ اس بات کا مجھ سے زیادہ معتبر گواہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

مجھے امید ہے کہ اشرف عمر کے اس حصے میں پہنچ کر کہیں اطمینان سے ٹِک کر بیٹھ رہے گا۔ لیکن اس کا یہ تازہ شعر پڑھنے کے بعد میں یہ بات پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا۔

جاؤں گا آسماں پر حدِ نظر سے آگے
رکھا ہے شاؔد میں نے پروں کو سنبھال کر

میں پاکستانی ادب پبلی کیشنز اور اس کے منتظم ضیاء الدین کا شکر گزار ہوں جنہوں نے بہت توجہ سے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

کراچی، یکم ستمبر ۲۰۱۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب اشرف شاد　　　　　　　　　　شعبہ: ناول نگاری

جناب اشرف شاد نثر نگار اور شاعر ہیں۔ ایک عرصے تک صحافت سے وابستہ رہے۔ ان دنوں سڈنی براڈ کاسٹنگ سروس میں شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ منظر عام پر آ چکا ہے۔ ان کا ناول 'بے وطن' ان کے گہرے مشاہدے اور ذاتی واردات کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ ایک حوصلہ مند اور باشعور ناول نگار ہیں۔ انہوں نے تلخ اور سنگین حقائق پر فنی گرفت کے ساتھ ناول کی کہانی بنی ہے۔ ملکوں ملکوں گھومنے کے باوجود اشرف شاد کے دل میں وطن کی محبت جاگزیں ہے اور بے وطنی کا تخلیقی کرب اس ناول کا محرک ہے۔

جناب اشرف شاد کو وزیراعظم، اسلامی جمہوریہ پاکستان نے ان کے ناول 'بے وطن' پر وزیراعظم ادبی انعام برائے سال ۱۹۹۷ء عطا کیا ہے

مقام: اسلام آباد

تاریخ: ۱۶ نومبر ۱۹۹۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں بحیثیت وزیراعظم، اسلامی جمہوریہ پاکستان

جناب اشرف شاد

کو وزیراعظم ادبی انعام (ناول)

برائے سال ۱۹۹۷ء

عطا کرتا ہوں۔

نواز شریف

محمد نواز شریف
وزیراعظم
اسلامی جمہوریہ پاکستان

مقام: اسلام آباد
تاریخ: ۲۶ رجب المرجب ۱۴۱۹ھ
۱۶ نومبر ۱۹۹۸ء

ادب میں سیاسی موضوعات

احمد ندیم قاسمی (مرحوم)

سیاسی موضوعات کو ناول کی بنیاد بنانا آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام اشرف شاد جیسا ماہر صحافی ہی کر سکتا تھا جو اس ملک کے بے رحمانہ سیاسی کھیل کا نزدیک سے جائزہ لیتا رہا ہے۔ اشرف شاد نے تخلیقی ادب میں سیاسی معاملات کو موضوع بنانے کی روایت کو نئی توانائی دی ہے۔ ادب میں سیاسی موضوعات سے گریز کی وجہ ادیبوں کی اپنی تن آسانی ہے لیکن اشرف شاد نے یہ بات غلط ثابت کر دی ہے کہ سیاسی موضوعات ادب کے ممنوعات میں شامل ہیں۔

(لاہور ۱۹۹۹ء)

قصۂ سپہ گری

اشرف شاد

آباؤاجداد

میرے والد صاحب مرزا علی اصغر بیگ نے اپنے انتقال سے قبل ہمارے آباؤاجداد اور ان کے ہندستان آنے کی تاریخ لکھنی شروع کی تھی لیکن وہ مکمل نہ کر سکے۔ ان کے مطابق میرے آباؤاجداد آذربائیجان کے مغل قبیلے جواں شیر سے تعلق رکھتے تھے۔ ہندستان میں مغل حکومت کے آخری دور میں (۱۸ویں صدی کے وسط میں) جب احمد شاہ ابدالی نے ہندستان پر حملہ کیا تھا تو اس کے لشکر میں ہمارے دادا کے دادا نگر دادا سگر دادا مرزا مدار اللہ بیگ ایک کمانڈر کی حیثیت سے شامل ہو کر ہندستان آئے تھے۔ احمد شاہ ابدالی تو ہندوستان سے واپس ہو گیا لیکن اس کی فوج کے بہت سے افسر اور سپاہی ہندستان ہی میں رہ گئے اور یہاں آباد ہو گئے۔

ہمارے اجداد میں سے مرزا مدار اللہ بیگ صاحب بھی یہیں رہ گئے اور انہوں نے صوبہ سنبھل کے صوبہ دار کی حیثیت سے مرادآباد میں سکونت اختیار کر لی۔ مرزا مدار اللہ بیگ صاحب نے انتقال کے بعد اپنی اولاد کے لیے زرعی اور سکنائی جائیداد چھوڑی جو ان کی اولاد نے آپس میں تقسیم کر لی۔ میرے نگر دادا مرزا عیوض بیگ کے حصے میں بائیس گاؤں اور مرادآباد میں کافی بڑی سکنائی جائیداد آئی۔ انگریزوں کا زمانہ آیا تو انہوں نے دیہات پر مال گزاری لگا دی جو ہمارے دادا کے غصے کا سبب بنی اور انہوں نے تمام دیہات چھوڑ دیے اور صرف موضع رتن پور اور موضع دانپور میں دو گاؤں اور مرادآباد کی سکنائی جائیداد اپنے تصرف کے لیے رکھی۔

مرزا عیوض بیگ صاحب کے انتقال کے بعد مرزا مظفر بیگ جائیداد کے وارث ہوئے۔ مرزا مظفر بیگ صاحب نے تمام زرعی اور سکنائی جائیداد وقف الاولاد کردی اور خود جائیداد کے متولّی بن گئے۔ جائیداد وقف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد کے تایا محمد نظیر بیگ بہت زیادہ عیاش طبع تھے۔ انہیں دوستوں کے ماحول نے بگاڑ دیا تھا۔ دوسرے تایا مرزا احمد نظیر بیگ پتنگ باز تھے۔ میرے والد کے یہ دونوں تایا تعلیم سے بے بہرہ تھے، روپے پیسے کی فراوانی تھی دونوں باپ کی چہیتی اولادیں تھیں۔ جب باپ سے رقم نہیں ملتی تھی تو ہندو ساہوکار سے لے لیا کرتے جو رقم دے کر خاموشی اختیار کرلیتا تھا۔ جب سود درسود کے نتیجے میں کافی رقم ہو جاتی تو ساہوکار والد صاحب کے دادا مرزا مظفر بیگ کے پاس جاتا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا مرزا صاحب آپ کے صاحب زادوں نے رقم قرض لی تھی اب کُل ملا کر اتنی ہوگئی ہے وہ ادا کردیں یا فلاں زمین مجھ کو عطا کردیں بڑی مہربانی ہوگی۔

اس زمانے کے لوگ بہت سیدھے ہوتے تھے ساہوکار کی چال میں آ جاتے اور اس طرح مراد آباد کی کافی شہری جائیداد ہندو ساہوکاروں کی تحویل میں چلی گئی۔ میرے پردادا مظفر بیگ نے وکیلوں سے مشورہ کر کے جائیداد وقف کردی اور خود متولّی بن گئے اور وقف نامہ میں تحریر کردیا کہ میرے انتقال کے بعد میرا سب سے چھوٹا لڑکا مرزا علی نظر بیگ ٹرسٹ کا متولّی ہوگا اور وقف نامہ کی رو سے میرے تمام ورثاء کو حصے کی سالانہ تقسیم وہی کرے گا۔ اس طرح میرے دادا علی نظر بیگ کل جائیداد کے متولّی ہو گئے۔

میرے دادا کے تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ جب جائیداد وقف ہو رہی تھی تو اس کا اثر میرے بڑے دادا مرزا محمد نظر بیگ پر پڑا اور وہ اس غم میں انتقال کر گئے۔ منجھلے دادا پتنگ بازی میں بالا خانہ کی چھت سے گر گئے جس سے ان کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ میرے محترم دادا مرزا علی نظر بیگ مولوی بھی تھے حاجی بھی تھے اور قرآن کے حافظ بھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جائیداد کے لیے ایک بہترین نظام قائم رکھا۔ انہوں نے تین شادیاں کیں آخری بیوی محترمہ دادی صاحبہ تھیں، جنہوں نے طویل عمر پائی اور اَسّی کی دہائی میں پاکستان میں ان کا انتقال ہوا۔

میرے دادا کا ۲۵ جنوری ۱۹۴۷ء کو انتقال ہوگیا انہوں نے اپنے ورثا میں ۲ لڑکے دو لڑکیاں اور محترمہ دادی صاحبہ کو چھوڑا، میرے تایا مرزا علی گوہر بیگ صاحب میری دوسری دادی

کی اولاد ہیں وہ پاکستان نہیں آئے اوران کا خاندان مرادآباد میں آباد ہے۔

دادا کے انتقال کے بعد میرے والداور تایا میں جائیداد کا متولّی بننے کے معاملے پر مقدمہ بازی شروع ہوگئی جس میں فوجداری تک ہوئی پورے خاندان میں میرے والد سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور میرے والد کے تایازاد بھائی پھوپی زاد بھائی اور خود تایا علی گوہر بیگ بالکل اَن پڑھ تھے اس لیے میرے والد کے تایازاد اور پھوپی زاد بھائیوں نے میرے والداور تایا کو آپس میں ٹکرادیا اور خود میرے تایا کے ساتھ ہوگئے۔ کافی مقدمہ بازی ہوئی ۱۸ مقدمے ایک ساتھ چل رہے تھے جائیداد کی تمام آمدنی دونوں فریقوں نے بذریعہ عدالت بند کرادی تھی۔ مغلوں کے درمیان یہ ایک زبردست معرکہ تھا جس کا انجام صرف بربادی ہوا۔ عدالت اوّل سے میرے والد مقدمہ ہار گئے میرے والد کی بہت بری حالت ہوگئی۔ لیکن بعد میں یہ مقدمے اپیل کے نتیجے میں میرے والد جیت گئے۔

(میرے والد کا یہ بیان جوانہوں نے اپنی اولاد کی طرف سے خود تحریر کیا تھا، یہاں ختم ہوجاتا ہے۔ وہ اپنی علالت کی وجہ سے یہ تحریر مکمل نہیں کر سکے اوراس کے بعد کا بیان میں اپنی یادداشت سے کام لے کر لکھ رہا ہوں۔ الف۔ شین)

میری والدہ کا تعلق مولوی اور حکیم خاندان سے تھا اوراس خاندان میں علم کے حصول کو اوّلیت حاصل تھی، کچھ صوفیانہ رجحانات بھی تھے۔ میرے نانا حکیم سیّد ہاشم علی نے اپنی تعلیم انگریزی میں حاصل کی تھی اس لیے انگریزوں کے اُس دور میں انہیں ملازمت حاصل کرنے میں کبھی دشواری نہیں ہوئی اور وہ بمبئی میں ملازم ہوئے، لیکن شادی کے بعد مرادآباد میں اپنا مطب کھول لیا اور حکمت کرنے لگے، وہیں ان کا انتقال ہوا۔ میرے دادا مرزا علی نظر بیگ بہت مذہبی اور مولانا اشرف علی تھانوی کے مقلّد تھے۔ میرا نام اشرف ان کی اسی عقیدت کا نتیجہ ہے۔ ہم پاکستان بننے کے بعد کئی سال تک مرادآباد میں ہی رہے لیکن میری والدہ کا خیال تھا کہ اگر وہیں رہے تو ان کے بچے مغل خاندان کی وراثت کے لیے ہونے والی جنگ میں تعلیم سے بے بہرہ رہ جائیں گے۔ میرے والد بھی مقدمے بازیوں سے بے زار ہوگئے تھے پھر نئی مملکت میں مستقبل بنانے کا شوق بھی تھا، اس طرح ہم بھی پاکستان آگئے۔ میرے والد تدریس کے پیشے سے وابستہ ہوئے اور آخری عمر تک مختلف اسکولوں میں پڑھاتے رہے۔

ہم آٹھ بھائی اور دو بہنیں تھے۔ تین بھائیوں کا بچپن میں انتقال ہوا، جبکہ دو بھائیوں شفقت بیگ جو کے ای ایس سی میں انجینئر تھے اور ثروت بیگ کا جو پی آئی اے میں انجینئر تھے چند سال پہلے انتقال ہوا۔ باقی دو بھائیوں میں ارشد بیگ مقامی حکومت میں انجینئر ہیں اور مظفر بیگ انکم ٹیکس سے منسلک ہیں۔ میری ایک بہن طلعت ممتاز صحافی اور اور بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت کے مشیرِ اطلاعات ارشاد راؤ کی اہلیہ ہیں۔ سب سے چھوٹی بہن درّہ شاہینہ ٹیچر ہیں اور ان کے شوہر فرخ مرزا انکم ٹیکس سے وابستہ ہیں۔

ہمارے خاندان کے جن بزرگوں نے علم و ادب کے حوالے سے بڑا نام حاصل کیا اس میں سب سے ممتاز ڈاکٹر معین الحق تھے جو میرے رشتے کے نانا تھے۔ ایک اسکالر اور تاریخ دان کی حیثیت سے علمی حلقوں میں ان کا بہت احترام تھا۔ وہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے بانی تھے۔ ددھیال میں مرتضٰی برلاس (سابق کمشنر اور ممتاز شاعر) اور عبیداللہ بیگ (کسوٹی فیم) تھے جو میرے رشتے کے چچا ہوتے ہیں۔ موجودہ نسل میں ناصر بیگ چغتائی ہیں جو میرے کزن اور چھوٹے بھائی ہیں۔

اہلِ خانہ

میری اہلیہ پروفیسر ڈاکٹر کنیز فاطمہ شآد نیوروفزیالوجسٹ اور دماغی امراض کی محقق ہیں۔ وہ امریکہ، آسٹریلیا، بحرین، متحدہ عرب امارات اور برونائی کی جامعات سے وابستہ رہی ہیں، پاکستان میں چند سال فارن فیکلٹی پروفیسر کے طور پر کراچی یونیورسٹی میں بھی رہیں۔ آج کل سڈنی کی ممتاز یونیورسٹی 'یوئی ایس' میں وزیٹنگ پروفیسر ہیں۔ میری بیٹی ثمن شآد، شادی شدہ ہے۔ لندن میں رہتی تھی، اب سڈنی میں قیام پذیر ہے۔ وہ لندن کے مشہور اخبار 'گارجین'، سڈنی کے اخبار 'سڈنی مارننگ'، 'ہیرالڈ' اور آسٹریلیا کے نشریاتی ادارے 'ایس بی ایس' آن لائن کے لیے لکھتی ہے۔ داماد میتھیو شارپ 'ایس بی ایس' ٹیلی ویژن کے آپریشنز منیجر ہیں۔ بڑا بیٹا ارسلان شآد بینکر ہے اور چھوٹے بیٹے سلمان شآد نے سڈنی کے ایکٹنگ کالج سے ڈگری لی ہے، وہ تھیٹر کرتا ہے اور ملبورن میں رہتا ہے۔

تعلیم، صحافت

ثانوی تعلیم شروع کی تو اسلامیہ کالج پہلا ادارہ تھا، اردو کالج سے بی اے کیا اور وہیں قانون کی تعلیم بھی حاصل کی لیکن مکمل نہیں کی۔ بڈاپسٹ، ہنگری میں صحافیوں کی تربیت کے بین الاقوامی ادارے سے صحافت میں ڈپلوما لیا۔ سڈنی کی یونیورسٹی آف نیوساؤتھ ویلز سے ایم اے آنرز کیا لیکن پی ایچ ڈی کا تحقیقی کام نامکمل چھوڑ دیا۔ پاکستان میں روزنامہ 'حریت'، روزنامہ 'مشرق'، روزنامہ 'اعلان'، روزنامہ 'امن'، ہفت روزہ 'الفتح'، ہفت روزہ 'معیار' میں سب ایڈیٹر، رپورٹر، اسسٹنٹ ایڈیٹر اور ایگزیکٹو ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ آسٹریلیا اور یو اے ای میں روزنامہ 'ڈان' کی نمائندگی کی۔ آسٹریلیا میں بھارتی نیوز ایجنسی 'یو این آئی' کا نمائندہ بھی رہا۔ بحرین میں 'گلف مرز' اور کویت میں 'عرب ٹائمز' کا اردو ایڈیٹر ہوا۔ متحدہ عرب امارات میں قیام کے دوران العین سے ایک ہفت روزہ انگریزی اخبار 'العین ٹائمز' کا اجراء کیا۔

ایّامِ اسیری اور ہجرت

ایوب خان کے دور میں طلبا تحریکوں میں حصہ لیا تو پولیس سے آنکھ مچولی معمول تھی۔ صحافیوں کی تحریکوں میں پیش پیش رہا اور صحافی یونین اور پریس کلب کا کئی سال تک منتخب عہدے دار رہا۔ بھٹو صاحب کے دور میں ۱۹۷۴ء میں آزادیٔ صحافت کے لیے ہونے والی جدوجہد کے دوران لاہور میں گرفتاری دی اور کئی ہفتے لاہور کیمپ جیل میں قید کاٹی۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء میں ہفت روزہ 'معیار' نے آزادیٔ اظہار کا پرچم اٹھایا اور کئی بار بند ہوا۔ میں صحافیوں کی تحریکیں منظم کرنے میں بھی پیش پیش تھا اس لیے اگست ۱۹۷۸ء میں مارشل لاء آرڈر ۱۲ کے تحت گرفتار کر لیا گیا اور تین ماہ تک کراچی اور حیدرآباد کی جیلوں میں بند رہا۔ 'معیار' پر پابندی تھی، دیگر اداروں میں روزگار کے دروازے بند تھے اس لیے ۱۹۸۰ء میں خود ساختہ جلاوطنی اختیار کی۔ تین سال نیویارک میں رہا اور پھر بحرین اور کویت ہوتا ہوا ۱۹۸۹ء میں آسٹریلیا آ گیا۔ اب وہی مستقل جائے رہائش اور میرا اختیار کردہ دوسرا وطن ہے۔

باخبری اور باضمیری

پیرزادہ قاسم صدیقی

آنے والے کل پر یقین رکھنے والے ادیبوں اور سوچ وفکر کرنے والوں کی ذمے داری ہے کہ وہ عدم اعتماد کی فضا سے لوگوں کو اعتماد کی فضا میں لائیں، اشرف شاد اپنی تحریروں سے یہ ذمے داری احسن طریقے سے پوری کررہے ہیں۔ وہ کمٹ منٹ کے آدمی ہیں اور انہوں نے تیکھے انداز میں مشکل موضوعات پر مخصوص طریقے سے قلم اٹھایا ہے۔ ایک اچھے تخلیق کار کے لیے باخبری، باضمیری، اور اظہار طلبی یعنی بات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی جو صلاحیت چاہیے وہ ان سے پوری طرح مالا مال ہیں۔ وہ اس اعتبار سے بھی بہت کامیاب آدمی ہیں کہ انہوں نے شاعری اور صحافت کے بعد ناول نگاری کے میدان کو بھی سر کرلیا ہے۔

(کراچی ۱۹۹۹ء)

سوانحی خاکہ

خاندانی نام: مرزا اشرف علی بیگ

قلمی نام: اشرف شآد

تاریخِ پیدائش: ۱۸؍جولائی، ۱۹۴۹ء

مقامِ پیدائش: مرادآباد، یو۔ پی

والد: مرزا علی اصغر بیگ (زمین دار، مدرّس)

والدہ: فضیلت بی بی عرف سردار بیگم بنتِ حکیم سیّد ہاشم علی (گھریلو خاتون)

تعلیم: پی۔ایچ۔ڈی (نامکمل) ۹۵۔۱۹۹۲ء۔ ایم۔اے آنرز ۱۹۹۲ء (یونیورسٹی آف نیوساؤتھ ویلز، سڈنی، آسٹریلیا) صحافت میں انٹرنیشنل ڈپلوما، ۱۹۷۵ء (انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ، بڈاپسٹ، ہنگری) بی۔اے۔ ۱۹۶۸ء (اردو کالج، کراچی یونیورسٹی)

رہائش اور شہریت: آسٹریلیا اور پاکستان کی دوہری شہریت۔

نقلِ مکانی: بھارت سے پاکستان ۱۹۵۲ء۔ پاکستان سے امریکہ ۱۹۸۰ء۔ امریکہ سے خلیجی ممالک (بحرین، کویت) ۱۹۸۳ء۔ خلیجی ممالک سے آسٹریلیا ۱۹۸۹ء۔ آسٹریلیا سے متحدہ عرب امارات ۲۰۰۳ء، امارات سے برونائی ۲۰۱۱ء، برونائی سے واپس آسٹریلیا ۲۰۱۳ء۔

اہلیہ: پروفیسر ڈاکٹر کنیز فاطمہ شآد، ذہنی امراض کی محقق۔ آسٹریلیا، امریکہ، متحدہ عرب امارات، برونائی اور پاکستان کی ممتاز جامعات اور تحقیقی مراکز سے وابستہ۔

اولاد: ثمن شاد، انگریزی زبان کی ادیب اور ڈرامہ نگار (مقیم سڈنی)
ارسلان شاد، بینکر (مقیم سڈنی)، سلمان شاد آرٹسٹ (ملبورن)

تالیف وتصانیف: ناول: 'صدرِ محترم' (۲۰۰۶ء)، ناول 'وزیرِ اعظم' (۱۹۹۹ء)، ناول 'بے وطن' (۱۹۹۷ء)، افسانے 'پہلی لکیر' (۲۰۱۲ء)
شاعری: 'اخبارِ عشق' (۲۰۱۳ء)، 'آ مرے قریب آ' (۲۰۰۵ء)، 'نصاب' (۱۹۹۶ء)
تالیف: شعرائے آسٹریلیا (۲۰۰۳ء)
تحقیق: مغربی ذرائع ابلاغ میں ترقی پذیر دنیا کی رپورٹنگ کے مسائل (انگریزی ۱۹۹۲)
صحافتی: سیاستیں کیا کیا (پاکستان کے سیاسی اور حکومتی رہنماؤں کے انٹرویوز اور کالموں کا مجموعہ۔

اعزازات: بہترین ناول کا وزیراعظم ادبی ایوارڈ برائے 'بے وطن'۔ ۱۹۹۸ء (اکادمی ادبیاتِ پاکستان)
نشانِ اردو۔ ۱۹۹۶ء، ۱۹۹۸ء (اردو سوسائٹی آف آسٹریلیا)
آسٹریلوی ملٹی کلچرازم کے فروغ کے لیے خدمات انجام دینے پر ایوارڈ۔ ۲۰۰۵ء (Federation of Ethnic Councils of Australia)

اسیری اور جلاوطنی: آزادیٔ صحافت کے لیے جدوجہد کے دوران گرفتار اور لاہور کیمپ جیل میں اسیری (۱۹۷۳ء)
فوجی حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے پر گرفتاری اور کراچی اور حیدرآباد کی جیلوں میں اسیری (۱۹۷۸ء)
فوجی حکومت کے قائم کردہ مقدمات اور اخبار اور مطبع پر پابندیوں کے بعد خود اختیار کردہ جلاوطنی (۱۹۸۰ء)

ملازمت: آسٹریلیا میں ایس۔بی۔ایس ریڈیو کی اردو سروس کے سربراہ کی حیثیت سے ریٹائرمنٹ (۲۰۰۷۔۱۹۹۲ء)

ایڈیٹر ریسرچ افیئرز اور ریسرچ نیوز، یو۔اے۔ای یونیورسٹی، العین، متحدہ عرب امارات (۲۰۰۳ء۔۲۰۱۱ء)

صحافیانہ وابستگی: پاکستان: روزنامہ 'حریت'، روزنامہ 'مشرق'، ہفت روزہ 'الفتح'، 'ہفت روزہ 'معیار'، ہفت روزہ 'منزل' (۱۹۸۰۔۱۹۶۸ء)

خلیجی ممالک: 'گلف مرر' بحرین (۸۶۔۱۹۸۳ء)، 'عرب ٹائمز' کویت (۱۹۸۹۔۱۹۸۷ء)

آسٹریلیا: ایس۔بی۔ایس ریڈیو (۲۰۰۷۔۱۹۹۲ء)

نمائندہ آسٹریلیا روزنامہ 'ڈان' کراچی (۲۰۰۵۔۲۰۰۰ء) نمائندہ آسٹریلیا یو۔این۔آئی، دہلی (۲۰۰۴۔۲۰۰۰ء)

رابطہ: Email: ashrafshad@hotmail.com

تخلیق کا فن اور بات کرنے کا ڈھنگ

شوکت صدیقی (مرحوم)

کتاب وہی ہوتی ہے جسے پڑھ کر آپ کے علم میں اضافہ ہو، جسے پڑھ کر آپ محسوس کریں کہ آپ نے کچھ حاصل کیا ہے۔ اشرف شآد کا ناول بے وطن بھی ایک ایسا ہی ناول ہے جسے پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ میرے علم میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ تخلیق کا فن اور بات کرنے کا ڈھنگ جانتے ہیں اور واقعہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ دل میں اتر جائے۔ اشرف شاد نے یہ ناول لکھ کر اپنے علم، مطالعے، مشاہدے اور تجربے میں دوسروں کو بھی شامل کیا ہے۔ اس ناول کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ آپ کے ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کرتا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ یہ نہ صرف انتہائی دلچسپ اور پُرلطف ناول ہے جب کہ اس حیثیت سے بھی ایک بڑا ناول ہے کہ یہ پڑھنے والوں میں اپنی جگہ بنائے گا۔

(کراچی ۱۹۹۷ء)

تبصرے

انصاف گریز معاشرہ اور 'جج صاحب' کا انتظار

امجد اسلام امجد

ہمارے آپ کے محترم اور پیارے ابنِ انشاء مرحوم نے ایک بار کہا تھا کہ 'منہ پر تعریف کرنا مشرقی آداب کے خلاف ہے' لیکن کتابوں کی تقاریبِ اجراء نے اس جملے میں مخفی طنز کی صورت کچھ ایسی بدل دی ہے کہ اب لوگ سرِ عام قصیدے پڑھتے ہیں اور انہیں کوئی ٹوکتا بھی نہیں۔ اب میرے لیے مشکل یہ ہے کہ برادرم اشرف شادؔ کی اس کتاب 'صدرِ محترم' کی جتنی تعریف میں کرنا چاہتا ہوں وہ مشرق تو کیا مغربی آداب کے بھی خلاف ہے، یہ واقعی ایک بہت شاندار کتاب ہے۔

چند برس پہلے جب اشرف شادؔ کو ان کے ناول 'بے وطن' پر قومی انعام ملا تو بے شمار چونکنے والوں میں، میں بھی شامل تھا کہ اس وقت تک اشرف شادؔ کی کوئی نثری تحریر میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ ادبی گپ شپ اور تبصروں میں عام طور پر سرکاری احکامات و اعزازات کو ملی بھگت، سفارش، اپروچ اور اندھے کی ریوڑیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس ردِ عمل میں انعام پانے والوں کے میرٹ کی بجائے احباب کی ذاتی فرسٹریشن کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ Main streem میں شامل لوگوں پر کسی نہ کسی 'لابی' کا ٹھپہ لگا کر دل کی بھڑاس نکالی جاتی ہے مگر جب کوئی اشرف شادؔ جیسا ایک مخصوص حوالے سے گمنام شخص اس فہرست میں نظر آئے تو معاملہ زیادہ سنگین ہو جاتا ہے یعنی جتنے منہ اتنی باتیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب باتیں عام طور پر متعلقہ کتاب کو دیکھے اور پڑھے بغیر ہوتی ہیں۔ دوست پبلی کیشنز اسلام آباد والے آصف محمود میرے بھی دوست اور ناشر ہیں، چنانچہ میں نے پہلی فرصت میں کتاب ان سے حاصل کی اور بہت سے پھیلائے ہوئے

تعصبات کی عینک لگا کر اس کا مطالعہ شروع کیا کہانی کی بُنت، کردار نگاری، ماحول اور اشرف شاؔد کی نثر کی روانی اور خوبصورتی کچھ ایسی تھی کہ میں اسے پڑھتا ہی چلا گیا اور آخری سطر تک پہنچنے سے بہت پہلے اس بات کا قائل ہو گیا کہ یہ کتاب واقعی انعام کی مستحق تھی اور یہ کہ اس کے توسط سے بہت دنوں بعد اردو زبان وادب کو ایک بہت اچھا ناول نگار میسر آیا ہے۔

Trilogy کو اردو میں پتہ نہیں کیا کہتے ہیں اور کچھ کہتے بھی ہیں یا نہیں لیکن ان تین کتابوں یعنی گزشتہ ناول 'وزیر اعظم' موجودہ کتاب 'صدرِ محترم' اور آئندہ مجوزہ تحریر 'جج صاحب' کے زیرِ عنوان اشرف نے جس بہت مشکل اور جرأت مندانہ کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ لائقِ صد تحسین ہے کہ بے شک ان کے کردار اور مقامات فرضی قرار دیے جائیں اور ان کی ترتیب و تشکیل میں Fantasy کا عنصر شعوری کوشش سے اجاگر کیا جائے یہ ایسی کہانیاں ہیں جن کے حقیقی روپ سے ہم سب اچھی طرح واقف اور آشنا ہیں۔

'صدرِ محترم' کے سیاسی کردار ایمان علی، کرم قریشی، جنرل سعید ملک، جنرل غلام اکبر، وزیرِ خزانہ حبیب الحق، ذہین جلالی اور فیاض منگی وغیرہ ایسے لوگ ہیں جن سے ملتے جلتے کردار آسانی سے پہچانے جا سکتے ہیں مگر اشرف شاؔد کے قلم کا اصل کمال اس وقت کھلتا ہے جب وہ انہی سے متعلق نوجوان کرداروں کی نہ صرف بے مثال تصویر کشی کرتے ہیں بلکہ ان کی انفرادی کہانیوں کو مرکزی پلاٹ کے ساتھ اس طرح جوڑتے چلے جاتے ہیں کہ 'تو من شدی، من تو شدم' کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ 'ایمان علی' مصنف کی wishfull thinking پر مبنی ایک تصوراتی کردار سہی لیکن یہ اتنا بھرپور اور دل کو چھونے والا ہے کہ مصنف کے ساتھ ساتھ قاری بھی اسے own کرنے لگتا ہے اشرف شاؔد کے اس ناول میں دکھائی گئی نئی نسل کے افراد بھی ایک سطحی اور مثالی ہیروز نہیں ہیں ان میں مقصود جیسے فراڈیئے، ساحل جیسے خواب گزیدہ اور میک جیسے دو دنیاؤں میں رہنے والے انقلابی دانشور اور تکریم جیسی سچائی سے محبت کرنے والی بہادر لڑکی، نیمی جیسی مبینہ طور پر ہم جنس پرست اور رخسار جیسی 'مجسم جسم' عورتیں بھی ہیں۔ اسی طرح سینئر نسل میں سردار جیسے موقع پرست، سجاد علی جیسے کمیٹڈ ایٹمی سائنس دان اور ڈاکٹر رحمان جیسے امریکی معاشرے میں رچے بسے پاکستانی بھی ہیں جو ڈالر اور دھرتی ماں سے محبت کے غیر ہموار پلڑوں میں اپنے آپ کو تولتے رہتے ہیں۔

'صدرِ محترم' میں اشرف شاؔد نے جس خوبصورتی سے ایوانِ اقتدار کی چکا چوند اور

غلام گردشوں کی تصویر کشی کی ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے وہ کم ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے اپنا ہی ایک برسوں پرانا شعر بار بار یاد آیا کہ ؎

امجد یہ اقتدار کا حلقہ عجیب ہے
چاروں طرف تھے عکس، کوئی آئینہ نہ تھا

ناول کا اختتام پاکستان اور بھارت میں ہونے والی ایک ایسی ایٹمی جنگ کا منظر پیش کرتا ہے جس کا پورا اسکرین پلے امریکی خفیہ ایجنسیوں کا بنایا ہوا تھا اور جس کے اسٹیج پر سارے کردار ایک سطح پر کٹھ پتلیاں بن جاتے ہیں۔ اس عظیم تباہی کے ملبے پر ناول کے کچھ نوجوان کردار ایک نئے پاکستان کی تعمیر میں مصروف دکھائی دیتے ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ اس یونی پولر دنیا میں ان کی حالت بھی لوڈو کے سانپ اور سیڑھی جیسے کھیل والی ہے کہ جس میں کسی بھی وقت انہیں پھر سے starting point پر لا کھڑا کیا جا سکتا ہے۔

اشرف شاد نے اس ناول میں ایک مایوس کن ماضی اور مخدوش مستقبل کے ساتھ زمانۂ حال میں جن روشن، تعمیری، انقلابی اور راست فکرانہ رویوں کی موجودگی کی نشاندہی کی ہے انہوں نے اس منظر کو نہ صرف مکمل تاریک ہونے سے بچا لیا ہے بلکہ ان آفاق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جہاں سے شفق ایک نئے سورج کے طلوع کی نویدِ مسرت سنا رہی ہے۔

مجموعی طور پر اس ناول (صدرِ محترم) کو حقیقت اور تصور کا ایک ایسا عمدہ امتزاج کہا جا سکتا ہے جس کا مطالعہ ہمارے شعور و آگہی کے ساتھ ساتھ دردمندی، انسانیت اور پاکستان دوستی کے جذبات کو مہمیز کرتا ہے۔ امریکہ میں بسنے والے مختلف کرداروں کی جو کیفیات اس ناول میں Discuss کی گئی ہیں، میں ذاتی تجربے کی بنا پر ان کی شہادت دے سکتا ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے وہاں عاطف بٹ اور صحافی شاہ صاحب جیسے کردار دیکھے ہیں اور ان سے ملا بھی ہوں۔

کہتے ہیں کہ فی زمانہ کسی زبان کے ادب کا معیار پرکھنے کے لیے اس میں کی گئی ناول نگاری کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے ہماری زبان اردو اپنی بہت سی خوبیوں، کمالات اور تخلیقی سرمائے کے باوجود اس میدان میں نسبتاً پیچھے ہے، اشرف شاد کی اس میدان میں آمد سے امید سی بندھ چلی ہے کہ اب یہ کمی بھی پوری ہو جائے گی۔ اس موقع پر میں اشرف شاد کو یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس انصاف گریز معاشرے میں ہم سب 'جج صاحب' کا انتظار کر رہے ہیں۔

(کراچی آرٹس کونسل میں پڑھا گیا۔ ۲۰۰۴ء)

اشرف شاد کے ناول

منشا یاد

اشرف شآد کے سارے ناولوں کی بنیاد فینٹسی اور فرضی واقعات و کردار ہیں لیکن ان کو پاک و ہند بلکہ عالمی پس منظر اور سیاست سے جدا کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ ناول محض حالات و واقعات کی عکاسی تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں اپنے ملک کو درپیش ہر خطرے، مسئلے اور معروضی صورتِ احوال کا حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے اور اس پر نہایت سچائی بالغ نظری اور دانش وری سے اپنی رائے دی گئی ہے۔ ان ناولوں کا مطالعہ نہ صرف پڑھنے والوں کے ادبی ذوق کی تشفی کا باعث بنتا ہے، بلکہ وطن عزیز کی سلامتی کے حوالے سے فکری سطح پر مضطرب قاری کی تسکین بھی کرتا ہے۔ ان کا سارا سماجی، تاریخی، نظریاتی اور سیاسی مواد پاکستان کی Authentic ریکارڈ اور جیتی جاگتی زندگی سے لیا گیا ہے۔ چنانچہ ناولوں کو ہر سطح پر نہ وقیع سمجھا گیا بلکہ انہیں پاکستان کے سنجیدہ اور اعلیٰ ادب میں نہایت گراں قدر اضافہ تصور کیا گیا ہے۔ یقیناً اس ہر آن بدلتی ہوئی جدید دنیا میں یہ ناول ایک نئے پاکستان، جس کا خواب ہر صاحب فکر اور ہر پاکستانی نے دیکھا ہے، کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈالیں گے۔

(اسلام آباد۔ ۲۰۰۸ء)

بحر سے تال تک

منشا یاد

اشرف شاؔد اردو کے ممتاز ناول نگار ہیں۔ پہلے ہی ناول 'بے وطن' پر اکادمی ادبیات پاکستان کا بہترین ناول کا ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے دیگر ناولوں میں 'وزیر اعظم' اور 'صدرِ محترم' شامل ہیں۔ شاعری کے دو مجموعے 'نصاب' اور 'آ مرے قریب آ' بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اب 'پہلی لکیر' کے نام سے ان کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔

جس طرح عموماً شاعر حضرات مشقِ سخن کی ابتدا غزل سے کرتے ہیں اسی طرح ہمارے ہاں عام طور پر فکشن رائٹر لکھنے کی ابتدا افسانہ نگاری یا مضمون نگاری سے کرتے ہیں پھر کچھ عرصہ بعد فرصت، توفیق اور دم خم ہو تو ناول کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی فطری طریقہ ہے کیونکہ آدمی تیرنا نہ جانتا ہو تو وہ سیدھا دریا اور سمندر میں چھلانگ نہیں لگا دیتا۔ گہرے پانی میں اترنے سے پہلے کم گہرے پانی یعنی چھوٹے چھوٹے تالابوں، کم گہری نہروں اور سوئمنگ پولز میں تیرنا سیکھتا ہے۔ لیکن مینڈک اور مچھلی کے بچوں کو کون تیرنا سکھاتا ہے۔ کچھوؤں اور مگرمچھوں کے بچوں کے بچے خشکی پر جھاڑیوں کی اوٹ میں دبائے گئے انڈوں سے نکلتے ہی سیدھا پانی کا رخ کرتے ہیں۔ اشرف شاؔد کی سرشت میں بھی بیان کرنے اور کہانی کہنے کی صلاحیت شامل تھی۔ اسے مختصر کہانیاں لکھ کر مشق کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اگر وہ ایسا کرتا تو عین ممکن ہے وہ اپنے ناولوں کا بہت سا بوجھ افسانوں میں بانٹ کر سبک دوش ہو جاتا۔ اس نے اس مجموعے میں اپنے ناولوں کے جو چار اقتباسات شامل کیے ہیں وہ بہت حد تک اپنی اپنی جگہ مکمل اور افسانے کی تکنیک

کے بہت قریب ہیں۔ اور حالانکہ میرا خیال تھا کہ ایک عرصے تک شیروں، ہاتھیوں اور گینڈوں کا شکار کرتے رہنے والے شکاری کو اگر چھوٹے جانوروں اور پرندوں کا شکار کرنا پڑ جائے تو اسے خاصی مشکل پیش آ سکتی ہے۔ وہ اگر رائفل استعمال نہ بھی کرے تو بارہ بور کی بندوق میں کبھی کبھی بڑے نمبر کا کارتوس استعمال کرنے سے شکار کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو سکتا ہے لیکن ایسا کہیں نہیں ہوا۔ اشرف شآد اپنے افسانوں میں بھی سرخرو اور کامیاب ٹھہرا۔ غالباً اس نے ناول نگاری کا آغاز کرنے سے پہلے کچھ افسانے لکھ رکھے ہوں گے۔

اس کتاب میں شامل چار ٹکڑے ان کے مختلف ناولوں کے اقتباسات ہیں اس طرح اصل افسانوں کی کُل تعداد دس ہے جن میں سے 'چوتھا کھلاڑی' اور 'تاریخ کا سبق' سیاسی موضوعات کے افسانے ہیں۔

ہمارے ہاں فکشن میں آمریت اور اس سے پیدا ہونے والی گھٹن اور جبریت پر بہت کچھ لکھا گیا۔ سیاسی بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کو موضوع بنایا گیا اور سیاست دانوں کے پیدا کیے ہوئے بحرانوں اور قومی نقصانات پر تنقید کی گئی لیکن ہمارے ہاں ادب میں سیاست دانوں اور ڈکٹیٹروں کے اقتدار میں آنے کے طور طریقوں، محلاتی سازشوں اور سیاسی حربوں پر بہت کم لکھا گیا جسے اشرف شآد کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب احمد ندیم قاسمی نے ادیبوں کی تن آسانی سے تعبیر کیا تھا۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کو صحافتی لکھاریوں کا موضوع سمجھ کر نظر انداز کیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اشرف شآد نے ادب میں اس کمی کو پورا کیا ہے۔

'چوتھا کھلاڑی' ایک ایسا ہی دلچسپ اور فکر انگیز افسانہ ہے۔ تیسری دنیا کے اکثر پسماندہ ممالک کی طرح اَسّی جزیروں پر مشتمل فیجستان پر جنرل راما کی حکمرانی تھی۔ اس نے فیجستان کی روایت کے مطابق اپنے دوست جنرل ٹوٹو اور جنرل ٹوٹو نے اپنے سب سے قریبی دوست جنرل شوشو کا تختہ اُلٹ کر اقتدار حاصل کیا تھا اور معزول ہونے والے تینوں صدور ساحل سے اَسّی میل دور سمندر کے بیچوں بیچ چھوٹے سے ٹیلے نما جزیرے، جس کا اصل نام کچھ اور تھا مگر یہ 'آمرستان' کے نام سے معروف ہوا، پر بنائی گئی جیل میں رہتے تھے۔ انہیں تمام سہولتیں اور عیش کے سامان میسر تھے لیکن برج کھیلنے کی میز نامکمل تھی اور انہیں چوتھے کھلاڑی جنرل راما کا انتظار تھا جس کا آنا اس ملک کی روایت کے مطابق یقینی تھا۔ مگر جنرل راما کو اپنے تاریخی شعور پر بہت فخر تھا اور وہ جانتا

تھا کہ فوج کا سربراہ کتنا ہی وفادار ہو، کسی بھی وقت بے وفائی کرسکتا اور آنکھیں پھیر سکتا ہے۔ اس لیے اس نے ایک طویل عرصہ تک صدارت کے ساتھ فوج کی سربراہی بھی اپنے ہی پاس رکھی۔ لیکن اب ہر طرح سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد اور تاریخ کا سبق بھول کر ایک ماہ پہلے ہی اس نے جنرل انطونو کو افواج کا سربراہ مقرر کیا تھا جو اس کا بھروسے کا آدمی تھا۔

ایک روز فیجستان کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں عام ڈاک سے آنے والے ایک خط نے سنسنی پھیلا دی۔ خط مسلح افواج کے سربراہ جنرل انطونو کے نام آیا اور اس پر 'ذاتی اور صرف آپ کے لیے' لکھا ہوا تھا۔ اس پر پڑوسی ملک موجستان کی مہر اور ٹکٹ لگے ہوئے تھے کیونکہ ہماری طرح وہ بھی ہر ملکی سازش اور واقعے کا تعلق کسی پڑوسی ملک سے جوڑ دیتے تھے۔ اس خط میں جنرل کی آسانی کے لیے ایک تقریر کا ڈرافٹ لکھ کر بھیجا گیا تھا جو اسے اقتدار پر قبضہ کرتے وقت قوم سے خطاب کرنے میں کام آسکتی تھی۔ وہی ہماری بار بار دیکھی اور سنی ہوئی تقریروں جیسی ایک تقریر۔

'میرے عزیز ہم وطنو اور محبِ وطن فیجستانیو! میں مسلح افواج کا سربراہ جنرل انطونو آپ سے مخاطب ہوں۔ کمانڈر انچیف کا حلف اٹھاتے وقت میں نے خود سے یہ عہد کیا تھا کہ ملک کی سیاست سے فوجی مداخلت کی روایت ختم کردوں گا۔ اپنے اس عہد پر میں اب بھی قائم ہوں لیکن میں نے اور میرے ساتھیوں نے ملک میں قومی مفاہمت کا حقیقی عمل شروع کرنے کے لیے اہم اقدامات اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ مفاہمت کی راہ ہموار کرنے کے لیے صدر جنرل راما نے میری تجویز پر صدارت سے استعفیٰ دے دیا ہے اور اپنے پرانے ساتھیوں کے پاس حفاظتی پناہ میں رہنے کی تجویز قبول کرلی ہے۔'

جنرل راما بہت سٹپٹایا، غرایا اور اپنے اعتماد کے جنرلوں کو پکارا مگر انہیں کہیں دور ڈیوٹی پر بھیج دیا گیا تھا۔ ملٹری سیکریٹری سے کہا کہ اس نے کوئی استعفیٰ نہیں دیا تو اس نے جنرل انطونو کی طرف سے دستخطوں کے لیے بھیجا گیا استعفیٰ اس کے آگے رکھ دیا۔ اس طرح معزول صدور کی چوتھے کھلاڑی کی کمی پوری ہوگئی اور برج کی میز مکمل ہوگئی۔ جنرل انطونو نے صدر جنرل راما کے ساتھ وہی کیا جو ہمارے ہاں جنرل ایوب خان نے گورنر جنرل سکندر مرزا، جنرل یحییٰ خان نے جنرل ایوب خان، جنرل ضیاء الحق نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو اور پرویز مشرف نے وزیراعظم محمد نواز شریف کے ساتھ کیا۔ اس لیے یہ کہانی ہمارے ہاں جنرلوں کی اقتدار پر قبضے کی بہت عمدہ تمثیل ہے۔ انداز

بیان بہت دلچسپ اور ڈرامائی ہے۔

'تاریخ کا سبق' بھی اسی موضوع پر ایک اور دلچسپ کہانی ہے۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اقتدار کا بھیڑیا بہت حساس ہوتا ہے۔ اس کے کان پکڑ کر رکھو لیکن اس زور سے نہ کھینچو کہ وہ ناراض ہو کر تمہاری چیر پھاڑ شروع کر دے۔ اس میں بھی تاریخ کے سبق کی بات کی گئی ہے اور ایسے بہت سے حوالے دیئے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ کا ایک ہی سبق ہے کہ تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھتا اور اقتدار کے لیے کسی قریبی دوست پر بھی بھروسا نہیں کیا جا سکتا، چاہے وہ کتنا ہی شریف النفس اور نیک شخص ہو۔ اگرچہ نام فرضی ہیں لیکن اس کہانی کا محلِ وقوع پاکستان ہے کیونکہ اس میں دارالحکومت کا نام جو اقتدار کا گڑھ ہے اور جہاں قومی اسمبلی کے اجلاس ہوتے ہیں، اسلام آباد ہے۔ اس میں گندر بہت طاقت ور اور بادشاہ گر پارٹی لیڈر ہے مگر اپنے دوست اور کلاس فیلو جمال عزیزی کے برعکس تاریخ سے کوئی سبق سیکھنے کو تیار نہیں۔ وہ وزیر اعظم شاہانی کو ہٹانے اور خود اقتدار سنبھالنے کے لیے رکن قومی اسمبلی جمال عزیزی کو اصرار کر کے عبوری دور کے لیے وزیر اعظم نامزد کرتا ہے اور اس طرح تاریخ کے جبر اور اقتدار کے بھیڑیے کی زد میں آ جاتا ہے۔ اس کہانی کا اختتام بھی نہایت دلچسپ اور ڈرامائی طریقے سے ہوتا ہے اور یہ بہت عمدہ طریقے اور سلیقے سے سیاست اور اقتدار کے ایوانوں میں ہونے والی سازشوں اور جوڑ توڑ کی عکاسی کرتی ہے۔

ان دونوں کہانیوں کو افسانے کا پیراہن پورا تو آ جاتا ہے لیکن ذرا تنگ محسوس ہوتا رہتا ہے۔ اس تنگی کا خود مصنف کو بھی ادراک ہے اور اس نے پیش لفظ میں کہا ہے کہ بقول ایک بزرگ دوست کے یہ ناول جیسے بڑے کینوس پر لکھی گئی کہانیاں ہیں۔ مگر تفصیل نگاری کے باوجود دونوں کہانیوں کا اختتام اور تاثر مختصر افسانے کا ہی ہے یا پھر زیادہ سے زیادہ انہیں طویل مختصر افسانے کہا جا سکتا ہے، ناولٹ یا ناویلا ہرگز نہیں۔ 'ایک کہانی غربت کی' بھی تکنیکی لحاظ سے ایسی ہی ایک کہانی ہے مگر اس کا موضوع بالکل الگ ہے۔ اس میں آپ بیتی کا تاثر اور کچھ عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں تاثر گہرا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ذہین شخص کی غربت کے خلاف جدوجہد کی عمدہ کہانی ہے۔

'آپ کہاں سے ہیں؟' میں نئے ملک میں آ کر بسنے والوں کی شناخت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جن لوگوں سے آپ کو کچھ لینا دینا نہ ہو ان سے آپ بے اعتنائی برت سکتے ہیں لیکن حسن و

جمال کا جادو اور خوب صورتی اپنی الگ منطق رکھتے ہیں۔ آپ انہیں نظرانداز کر سکتے ہیں نہ ہی ان سے بے اعتنائی روا رکھ سکتے ہیں۔ اس میں ایک شاعر نزار شہبانی کی جس کا تعلق عراق سے ہے بہت عمدہ کردار نگاری کی گئی ہے۔ اسے اس سوال سے بڑی چڑ ہے کہ آپ کہاں سے ہیں اور وہ یہ سوال پوچھنے والے کو بری طرح ڈانٹ دیتا بلکہ اس کے خلاف نسلی تعصب کا مقدمہ دائر کرنے کی دھمکی دے دیتا ہے۔ لیکن ایک نہایت حسین خاتون ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھ کر بے اختیار اس سے پوچھ بیٹھتا ہے کہ وہ کہاں سے ہے اور جب وہ بتاتی ہے کہ اس کا تعلق عراق سے ہے تو وہ بھی نہایت فخر سے اسے بتاتا ہے کہ میں بھی۔

'پہلی لکیر' فیکٹس اور فکشن کی آمیزش سے لکھا ہوا ایک اہم افسانہ ہے جس کا لوکیل مقبوضہ کشمیر اور اس میں جو واقعہ ۲۰۰۰ء میں پیش آیا اس کا احوال وقوع پذیر ہونے کے پچاس برس بعد ۲۰۵۰ء میں پس منظر کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس میں مرکزی کردار حاجی گونگے شاہ کا کردار نہایت خوبصورتی سے بُنا گیا ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے سرد موسم اور پہاڑی بود و باش کا بھی بہت عمدگی سے ذکر ہوا ہے۔ اس کا موضوع اور مرکزی خیال منٹو کے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' سے ملتا جلتا ہے۔ بشن سنگھ کی طرح حاجی گونگے شاہ بھی اس کنٹرول لائن کے اسی مقام پر دفنا دیا گیا جہاں اس کی لاش گری تھی اور اقوامِ متحدہ کی امن فوج کے زیرِ انتظام سرحد کے دونوں طرف ہر سال اس کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائی جاتی ہے۔

'کاش' ترکی کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی ہے جس میں سفرنامے کا بہت سا مواد برتا گیا ہے۔ مصنف نے خود بھی وضاحت کی ہے کہ اس کے مقامات حقیقی اور کردار اور واقعات افسانوی ہیں۔ اس کا اختتام خاص طور پر نہایت عمدہ اور افسانوی ہے۔ سفرنامے کے مواد پر مشتمل ایک اور کہانی 'شکیلہ' ہے جو تھائی لینڈ کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ اس میں تھائی لینڈ کی بود و باش کو بہت تفصیل اور عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ عورت ذات کو کموڈٹی بنا دینے اور نسوانیت کی تذلیل کے دل خراش مناظر کے ساتھ ساتھ اس میں ایک مسلم عورت میو عرف شکیلہ کا کردار اس علاقے کے حالات اور معاشرت کو سمجھنے میں خاصی مدد دیتا ہے۔

'لپ اسٹک' ایک مختلف ذائقے کی اور نفسیاتی کہانی ہے۔ ایک نوجوان لڑکی کو لپ اسٹک سے کراہت آتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ شادی کے موقع پر بھی لپ اسٹک لگاتی ہے نہ لگانے دیتی ہے۔

یہ بات سارے خاندان اور برادری میں معمہ بنی رہتی ہے تا آنکہ اپنے شوہر کے اصرار پر وہ بتاتی ہے کہ اس کراہت کا تعلق اس کے لڑکپن کے ایک واقعے سے ہے۔ غالباً یہی وہ کہانی ہے جس کو پڑھ کر ان کی ایک اور کہانی 'بدلتے زمانے' کے ایک افسانہ نگار ایڈیٹر' کاظمی صاحب' بدک گئے تھے اور اسے فحش قرار دے دیا تھا کیونکہ انہوں نے آج تک کسی عورت کو اپنی بیوی تک کو بے لباس نہیں دیکھا تھا مگر کچھ دنوں ل بعد جب انہوں نے اپنے پوتے کے کمپیوٹر پر عریاں بدنوں کی بہار دیکھی تو انہیں باور آیا کہ زمانہ واقعی بہت بدل گیا تھا۔

اشرف شاؔد کے ناولوں کی طرح ان کے افسانے بھی محض حالات و واقعات کی عکاسی تک محدود نہیں بلکہ ان میں اپنے ملک اور معاشرے کو درپیش ہر خطرے، مسئلے اور معروضی صورتِ احوال کا حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے اور اس پر نہایت سچائی، بالغ نظری اور دانشوری سے اپنی رائے دی گئی ہے۔ ان کی سیاسی، تاریخی اور سماجی معلومات حیران کن ہیں۔ ان افسانوں اور ناول کے ٹکڑوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی ریڈابیلٹی اور موضوعات کا تنوع ہے۔ یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ اردو کے ایک نامور ناول نگار نے شہرت و مقبولیت حاصل کرنے کے بعد بھی افسانے کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ مجھے تو ان کا یہ ادبی سفر سمندر سے تال کی طرف مراجعت کا سفر معلوم ہوا۔

وسیع مشاہدہ، وقیع لہجہ اور شجیع اسلوب نگاری

محمود شام

اشرف شاؔد جب ملتے ہیں تو ہم ناشاد ہو جاتے ہیں۔

وہ دن۔ وہ راتیں۔ وہ عزم وہ باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ جب ہم نے بالکل ہٹ کر ایک نئے ہفت روزے کی اشاعت کا سفر بہت جوش اور جذبے سے کیا تھا۔

'معیار' ایک عشق ہے جو ادھورا رہ گیا۔ ایک خواب ہے جو تعبیر نہ پا سکا حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

۱۹۷۶ء میں ہم سب نے مل جل کر صحافت میں واقعی ایک معیار قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ رؤف شمسی، احمد شمسی، اشرف شاؔد، انور سمیع، صبیح الدین غوثی، مجاہد بریلوی، شہناز احد، رفیع احمد فدائی، فوٹو گرافر سعید اقبال۔ کچن میں ایک روٹا، جس پر ٹائٹل پرنٹ کرتے تھے، ہمارے خوش نویس، پرنٹر، سبھی جذبات سے سرشار تھے۔ اور پھر جب ابتلاؤں کا وقت شروع ہوا۔ تو سب مزاحمت کے لیے بھی تیار تھے۔ عام روش سے ہٹ کر چلنے کا ایسا خبط تھا کہ اس کی افتتاحی تقریب کاک ٹیل سے ہوئی تھی۔ اچھے دن تھے۔ میکدے کھلے تھے۔ امیروں کے لیے بھی اور غریبوں کے لیے بھی۔ ڈیفنس کلفٹن والے بھی پیاس بجھا لیتے تھے۔ لیاری رنچھوڑ لائن والے بھی۔ اب تو ایسی حکومتیں آ رہی ہیں، منتخب اور فوجی دونوں، جو اپنے شہریوں کے لیے خالص اور اچھی شراب بھی فراہم نہیں کر سکتیں۔ کچی شراب پی کر لوگ اک گونہ بے خودی میں نہیں دنیا سے ہی کوچ کر رہے ہیں۔ اس معاملے میں پاکستان اور ہندوستان برابر ہیں۔ وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ان کے ہاں حکومت کی تبدیلی ہمیشہ ووٹ سے ہوتی ہے۔ ابھی کول کتہ میں بھی بڑی تعداد میں زہریلی شراب

سے ہلاکتیں ہوئی ہیں۔

رسالہ 'معیار' تو اپنی جگہ۔ کسی شعبے میں بھی 'معیار' اس ملک کے سول اور فوجی قائدین کو پسند نہیں رہا ہے۔ یہ بھی ہماری بدقسمتی ہے کہ پاکستان واحد ملک ہے جہاں سیاسی اور عسکری قیادت کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ دوسرے ملکوں میں فوجی صرف ملازم ہوتے ہیں، قائد نہیں ہوتے۔ لیکن ہم دنیا سے مختلف تجربے کر رہے ہیں۔ ملک کی سلامتی اور بیرونی دنیا سے تعلقات کی ذمہ داری فوج نے سنبھال رکھی ہے۔ سیاستدانوں پر اعتبار نہیں ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اسمبلیوں میں جیسے خواتین اور اقلیت کے لیے محفوظ نشستیں رکھی جاتی ہیں، اسی طرح پنجاب۔ سندھ۔ بلوچ رجمنٹوں۔ ایف سی۔ رینجرز کے لیے بھی اہتمام کرلیا جائے تو وہ آنکھ مچولی ختم ہو جائے جو آج بھی جاری ہے۔ ان کی رہنمائی تو ہم تسلیم کر ہی چکے ہیں۔ کل رات جب آرمی چیف کیانی نے ۳ گھنٹے تک اپنے ہم قافیہ وزیراعظم گیلانی سے ملاقات کی تو بریکنگ نیوز یہی تھی۔ دونوں رہنماؤں نے مجھ سمیت باہمی دلچسپی کے امور پر بات کی۔

یہ جو کچھ ہو رہا ہے، جس کے مناظر ہم چینلوں پر دیکھتے ہیں۔ یہی اشرف شآد کے ناولوں اور افسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ وہ اگرچہ وطنِ عزیز سے برسوں سے دور رہتے ہیں۔ مختلف براعظموں میں زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن خواب یہیں کے دیکھتے ہیں 'معیار' کے خلاف جنرل ضیاء الحق کی کارروائیوں سے ہم سب کو نئی دنیائیں دیکھنے کا موقع ملا۔ کراچی جیل۔ حیدرآباد جیل۔ پھر آفیشل سیکریٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کے تحت دو مقدمات میں گیارہ سال تک اسپیشل کورٹ میں پیشیاں بھگتتا رہا۔ گیارہ سال بعد اس خصوصی عدالت کو یہ پتہ چلا کہ یہ جرم ان کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے میں ۱۹۸۹ء سے ضمانت پر ہوں۔ میرے ضمانتی کے کاغذات اسی عدالت میں ہیں۔ ایف آئی اے کو اگر کبھی دائرۂ اختیار والی عدالت مل گئی تو مقدمہ دوبارہ شروع ہوسکتا ہے مجھے اس عرصے میں انکم ٹیکس سیلز ٹیکس کے دفاتر میں فائلیں اٹھا اٹھا کر حاضریاں بھی دینا پڑیں۔ سپریم کورٹ ہائی کورٹس توہینِ عدالت کے مقدمات۔ میں شکر گزار ہوں مارشل لاء کا۔

میں بہت خوش ہوتا ہوں، جب خبر ملتی ہے کہ اشرف شآد کے ناول کو ادبی انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ ان کی مختلف کتابوں کی مختلف ممالک میں رونمائی۔ پھر ادبی جرائد میں ان کی تحریروں کا حوالہ۔ 'معیار' کے خلاف اگر آمرانہ کارروائی نہ ہوتی تو اشرف شآد بھی ان تجربات اور محسوسات

سے محروم رہتے جو انہیں جیل، حوالات پھر جلاوطنی میں میسر آئے۔ 'معیار' جاری رہتا، تو انہیں صرف ایک صحافی کی حیثیت حاصل ہوتی۔ اب وہ ایک نامور ناول نگار، افسانہ نویس اور شاعر کی حیثیت سے تسلیم کیے گئے ہیں۔ ان کا مشاہدہ بہت وسیع۔ لہجہ وقیع اور اسلوب نگارش بہت شجیع ہے۔ الفاظ کی نشست و برخاست موضوع اور محل کے بہت قریب رہتی ہے۔ آج کل دنیا بھر میں سیاسی ناول بہت مقبول رہتے ہیں۔ مختلف ادوار کے بارے میں سیاسی کتابیں بھی ناول کے انداز میں لکھی جائیں تو زیادہ قابلِ قبول ٹھہرتی ہیں۔ اردو میں سیاسی فکشن کی کمی تھی یا ہمارے افسانہ نگار اس سے گریز کرتے تھے۔ علامت اور استعاروں میں پناہ لیتے تھے۔ اشرف شاؔد اس اجتنابی کیفیت کی بجائے حقیقت سے زیادہ قریب رہتے ہیں۔ منشایاد مرحوم ہمارے مسلّمہ افسانہ نگار تھے، ان کی تقریظ اشرف شاؔد کی تحریروں کے لیے ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ 'پیلی لکیر' مہذب ملکوں کی ٹریفک میں بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اسے پار کرنا بہت سی قانونی کارروائیوں کا موجب بن جاتا ہے۔ اشرف شاؔد کے ہاں یہ بین الاقوامی اور علاقائی تناظر میں سامنے آتی ہے، اور بہت عجیب و غریب تاثر پیش کرتی ہے۔ پھر اسے یہ ۲۰۵۰ء تک لے جاتے ہیں۔ وقت پاکستانیوں کے لیے ہمیشہ ایک سا مشکل ہی رہتا ہے۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں 'سیاست کے سوا'، لیکن یہ غم بھی ہمارے ہاں سیاست کے بطن سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ معاشرتی ناہمواری۔ اخلاقی دیوالیہ پن۔ جس سے بھی ہمارا معاشرہ اور فرد دوچار ہے۔ وہ سب اشرف شاؔد کے موضوعات ہیں۔ ان کی زندگی چونکہ اس کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں گزر رہی ہے، اس لیے ان کا کینوس پھیلتا جارہا ہے۔ 'کاش' اس کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

جزئیات اور تفصیلات کی عادت چونکہ ناول نگاری سے پڑی ہے، مختصر کہانیوں میں بھی یہ در آتی ہے۔ اس کا فیصلہ تو ہمارے نقاد کر سکتے ہیں کہ وہ ہونی چاہئیں یا نہیں۔ صحافت کے بعد ناول۔ اس کے بعد افسانے اب انہیں ٹیلی ویژن ڈرامے کی طرف آنا چاہیے۔ کہ اب ابلاغ کا یہ زیادہ جدید اور مستحکم وسیلہ ہے۔

(کراچی پریس کلب کی تقریب میں پڑھا گیا مضمون، ۲۰۱۱ء)

زبان و بیان کی سلاست، روانی اور شگفتگی

شکیل عادل زادہ

اشرف شاد کا ناول کئی طرح سے آسودہ اور کہانی کے لطف سے سرشار کرتا ہے اور فکر و نظر کی ترغیب دیتا ہے۔ انہوں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے آشیانے کا سکون اور غیر کے محل دو محلے کی ویرانی اور بے سکونی کا امتیاز واضح کیا ہے۔ اس میں زبان و بیان کی سلاست اور بڑی روانی اور شگفتگی ہے۔ اشرف شاد کا مشاہدہ بہت گہرا ہے اور وہ ممالک جن سے ان کا واسطہ پڑا ہے ان کے سیاسی سماجی حالات سے انہیں مکمل آگہی حاصل ہے۔ پاکستان کے سیاسی اور سماجی منظر نامے اور یہاں کے نظام فکر و خیال پر بھی ان کی گہری نظر ہے انہیں بہت سی ایسی در پردہ کہانیوں کا علم ہے جو اپنے قاری کو چونکاتی اور اداس کر دیتی ہیں۔ یہ ناول (بے وطن) پڑھ کر اشرف شاد کا مرتبہ میری نظروں میں بلند ہوا ہے اور وہ ایک پختہ کار ناول نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔

(کراچی ۱۹۹۷ء)

اشرف شاد کا ناول ''وزیر اعظم''

پروفیسر نذیر احمد

سب سے پہلے تو ناول ''وزیر اعظم'' کے مصنف کو ان کی جرأتِ رندانہ پر داد دینی چاہیے کہ وہ بلاخوف بھڑکتی آگ میں کود پڑے ہیں کسی رو رعایت کے بغیر، نہایت معروضی انداز میں انہوں نے ہمارے یہاں کی سیاسی وسماجی حقیقت کو سمجھنے اور فنی وسیلوں کے ذریعے اس کی ہو بہو تصویر اتارنے کی کوشش کی ہے۔ سیاسی وسماجی حقیقت ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی ہے ہم سب اس کے گھناؤنے مظاہر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس بری طرح سے کہ دم گھٹتا ہے۔ خوف وہراس کے اس عالم میں فریادوں کو راہ نہیں ملتی اور وہ سینوں کے اندر دم توڑ رہی ہیں۔ ان فریادوں کو کوئی مجسم کر دکھائے تو کون کافر اس کی داد نہیں دے گا۔

جب جنگل میں آگ لگی ہو تو جنگل کے اندر سے اس کی تیزی اور وسعت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان جنگل سے باہر کھڑا ہو کر، آسمان سے باتیں کرتے شعلوں کو دیکھے اور ان چیزوں کا شمار کرے جو بھسم ہو رہی ہیں۔ بربادی کا منظر دیکھنے اور دکھانے کے لیے جو فاصلہ درکار ہوتا ہے وہ اشرف شاد کو حاصل ہے۔ انہوں نے ہمیں آسٹریلیا سے نیو ساؤتھ ویلز یونیورسٹی کے اندر بیٹھ کر ہمارا جنگل دکھایا ہے اور اُن اثاثوں کا کچھ اندازہ لگایا ہے جو ضائع اور برباد ہو رہے ہیں۔ اِن اثاثوں میں سب سے قیمتی شے ہمارا قومی مقدر ہے جو اپنے تاریخی تناظر سمیت تاریکیوں میں ڈوب رہا ہے۔

جنرل ضیاء الحق کے طویل آمرانہ دور کے بعد اور اس کے موذی اثرات کے تسلسل میں جو

سیاسی کلچر پروان چڑھا ہے اور اس میں جو عناصر سرگرمِ عمل رہے ہیں ناول ''وزیرِاعظم'' ان سے سروکار رکھتا ہے۔ ناول کا اختتام ان دنوں پر ہوتا ہے جب اقتدار سردار فاروق احمد خان لغاری کو منتقل ہوا۔ ان برسوں میں ہمارے سیاسی منظر پر نمودار ہونے والے کردار اور ہماری تقدیر سے کھیلنے والے حاضر و غائب جادوگر، ناول ''وزیرِاعظم'' میں نظر آتے ہیں۔ ناول نگار نے کوشش کی ہے کہ انہیں پہچاننے میں قارئین کو کوئی مشکل پیش نہ آئے، چنانچہ کرداروں سے وابستہ بعض ایسی باتوں کا ذکر کر دیا گیا ہے جو ہر خاص و عام کے علم میں ہیں۔ اجازت چاہتا ہوں کہ اس مرحلہ پر ان میں سے چند ایک کا مختصر ذکر مصنف کے اپنے الفاظ میں دہرا دوں تاکہ میں اور آپ تفہیم و تعبیر کی یکساں سطح پر آ جائیں۔ چند زعماء جو اس دوران میں ہم نے دیکھے۔

''وہ جب کشمیر کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں ملک ملک گھومے گا تو بدن پر ادھ کھلی پیلی شیروانی، سر پر لال ٹوپی اور ہاتھوں میں حقہ، دنیا بھر کے اخبار اور ٹی وی کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ بات حقے سے چلے گی اور مسئلہ کشمیر تک پہنچے گی۔'' (صفحہ 47)

''شیر پنجاب تہمینہ درانی کی انگریزی میں چھپ کر آئی ہوئی نئی کتاب کا مزا لے رہا تھا، شاید کوئی جملہ سمجھ میں آ گیا تھا۔'' (صفحہ 46)

''ریاض توصیف کو بیٹھے بیٹھے کشمیری پلاؤ کی ڈکاریں آنے لگیں۔ اس نے اپنے موٹے ہوتے ہوئے سراپے کو دیکھ کر سوچا اب کھانے میں احتیاط کرنی پڑے گی۔ صبح ناشتے میں مرغ چھولے اور پراٹھے، دوپہر کے کھانے میں نان اور پائے اور اب رات کے کھانے میں قورمہ، پلاؤ اور پستے کی آئسکریم...... ریاض توصیف نے کاروبار کے جھوٹے بہی کھاتوں کی طرح سیاست میں بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔ جھوٹ بولنا، وعدے کرنا اور پھر انہیں بھول جانا...... کرکٹ ریاض توصیف کا ٹوٹا ہوا سپنا تھا۔'' (صفحہ 67 ,49 ,71)

''ملک چلانا فصل اگانے، دکانداری کرنے یا لیفٹ رائٹ کرنے کا کھیل نہیں۔ یہ ان تمن داروں اور سرداروں کا کام ہے جن کی صلاحیت خوشحالی کی نہریں نکال سکے، جن کا زورِ بازو مضبوط قلعوں کی طرح ہو، جن کے فیصلوں میں عدلیہ کا وقار چھپا ہوا ہو۔'' (صفحہ 114)

''وزیرِاعظم ہاؤس میں بابا کی آمد و رفت اور کمالات کا طلسم بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک دن اس نے پتھر سے ڈبل روٹی کی جگہ ناشپاتی برآمد کر کے آصفہ کو دی تھی اور کہا تھا اس کو کھانے سے اس کی

جوانی سدابہار ہو جائے گی۔ آصفہ نے اسی وقت بڑے شوق سے پوری کی پوری ناشپاتی کھالی تھی۔ بیج تک نہیں چھوڑے تھے۔'' (صفحہ 84)

ان مثالوں سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ناول نگار نے جو کردار پیش کئے ہیں وہ ہمارے جانے پہچانے ہیں، مگر ناول کے پلاٹ میں جو رول وہ ادا کرتے ہیں اور جن واقعات سے گزرتے ہیں وہ بعینہ، ویسے نہیں جیسے وہ ہماری تاریخ کے صفحات پر بکھرے ہیں۔ دراصل ناول نگاری کا پہلا اور سب سے پرانا تقاضا یہ ہے کہ ایک پلاٹ استوار کیا جائے اور اس کی بنیاد ایک کہانی پر رکھی جائے۔ کہانی کے واقعات میں تسلسل اور قرینے پیدا کئے جائیں، کرداروں اور ان کے مکالموں کو ان کے اندر سمویا جائے، انہیں زمان و مکان کا پابند کیا جائے اور بیان میں ایسا زور پیدا کیا جائے کہ قاری ناول کے فریم ورک کے اندر ان واقعات کو صحیح تسلیم کرے اور کرداروں کو جیتا جاگتا محسوس کرے۔ یہ تقاضا پورا کرنے کے لیے اشرف شآد نے بہت بکھرے ہوئے مواد کو کہانی کے Sequence میں پرویا ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور ان سے وابستہ کرداروں کو باہم گفتگو کرتے دکھایا ہے۔ ان کے مضحک پہلو اجاگر کئے ہیں۔ واقعاتی تفصیلات میں ترمیم واضافہ کیا ہے۔ ان کا سیاق وسباق پیدا کیا ہے۔ مبالغے کو بطور حربہ استعمال کیا ہے۔ سیاست، صحافت، سفارت، بیوروکریسی، ایجنسیوں اور فوج سے متعلق درجنوں کردار ناول میں شامل ہیں۔ ان کی تعمیر میں وہ تمام معلومات استعمال کی گئی ہیں جو ملکی اور غیر ملکی واسطوں سے سامنے آئی ہیں۔ مطالعہ ومشاہدہ کے علاوہ گپ شپ اور قیاس آرائی بھی شاملِ بیان ہے۔ فینٹیسی کا بھی خاصا عمل دخل ہے۔ جب تک پلاٹ کا تسلسل قابل یقین رہے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ واقعاتی تفصیل حقیقی ہے یا فرضی۔ فکشن کا سچ تاریخ کے سچ سے مختلف طریق کار سے حاصل ہوتا ہے۔ ادب وفن کی دنیا میں اصل بات مجموعی تاثر کی ہے، جو ایک ناول نگار اپنے فکشن کے ذریعے قاری کے ذہن میں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس تاثر کو مبنی بر صداقت ہونا چاہئے۔

اشرف شآد نے کوئی تاریخ کی کتاب نہیں لکھی، کوئی معاشرتی دستاویز ترتیب دینے کی جستجو نہیں کی جس کی بنیاد سراسر تحقیق وتفتیش پر ہو۔ ہمارے حالات میں ایسے موضوع پر تحقیق ممکن ہی نہیں۔ شہادتوں کو اس عیاری سے مٹایا جاتا ہے کہ تاریخ دان اور سوشل سائنٹسٹ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانے میں حق وصداقت کے اظہار کے سلسلے میں زیادہ تر بوجھ

تخلیقی ادب پر ہے، بالخصوص ایسے تخلیقی ادب پر جو جاری نظام کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ سیاسی طور پر ہم جس مضحکہ خیز اور المیہ صورتحال میں گرفتار ہیں اس کے بارے میں جو تاثر ناول ''وزیراعظم'' سے ابھرتا ہے وہ نہایت حقیقی اور سچا محسوس ہوتا ہے۔ ہوسِ زر، اقتدار پرستی، شہوانی خواہشات کا تعاقب، استحصال اور جبر جس طرح سے ہمارے معاشرے میں سرایت کر گئے ہیں، ان کی بہت عمدہ تصویریں ناول کے صفحات پر بکھری پڑی ہیں۔ اصول پسندی، دیانت داری، قانون، علم، جمہوریت، عقل وفراست سے ہمارا رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔ واقعی لگتا ہے سب کچھ ڈھونگ اور جھوٹ ہے اور ہماری تقدیر طاقتور مافیا کے سپرد ہے۔ عوام الناس بے بس اور بے وقعت ہیں، جو تماشا جاری ہے وہ اس کے مجبور تماشائی ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کے دکھوں کا کیا علاج ہے۔

''وزیراعظم'' کے کردار بالعموم یک رخے ہیں۔ صرف ایک کردار میں جامعیت ہے، اور یہ ہے ذہین جلالی۔ پیشے کے اعتبار سے صحافی اور ناول کا مرکزی کردار، ناول کے اندر جو اخلاقی کشمکش دکھائی گئی ہے اس کا علم بردار یہی کردار ہے۔ اسے درد اور امید کی زنجیر کی تلاش ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ذہین جلالی نہ صرف راوی اور مبصر ہے بلکہ متوسط طبقے کی روحانی اذیت کا مظہر بھی ہے۔ جو اپنے مادر پدر آزاد سیاسی کلچر کے اندر رہتے ہوئے محسوس ہوتی ہے، مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کلچر کے خلاف برسرِ پیکار ذہین جلالی بالآخر خود بھی اس کا حصہ بن جاتا ہے۔

وزیراعظم کا پلاٹ پھیلا پھیلا اور دھندلا ہے۔ جیسا کہ Picareque ناولوں کی روایت ہے بعض مقامات پر اتفاقات کا سہارا لیا گیا ہے جو ہیں تو زندگی کا حصہ، مگر ناول کی ساخت میں کھٹکتے ہیں۔ مکالموں میں بالعموم روانی اور شگفتگی ہے۔ جہاں ناول کا موضوع بہت فکری شکل اختیار کر لیتا ہے، وہاں جی بی شا کے ڈراموں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جیسے آخری حصے میں ذہین جلالی اور کرم قریشی کے مابین طویل بحث، جہاں مکالمے بیوروکریسی کے خلاف اور حق میں مباحثہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ناول نگار کو سنسنی خیزی سے بھی شغف ہے۔ کردار نگاری اور پلاٹ دونوں میں یہ عنصر چبھتا ہے۔ اس کی دو مثالیں ذہین جلالی سے متعلق ہیں۔ ہنگری میں الزبتھ کا انجام اور اسلام آباد میں مرینہ شاہ سے شادی اور جدائی۔ ناول کے تار و پود میں رچے بسے تلخ طنز کو قابل برداشت بنانے، فکری بوجھ کو کم کرنے اور غالباً حقیقت نگاری کو زیادہ جامع بنانے کے لیے ناول نگار نے دو حربے استعمال کئے ہیں، ایک جنس نگاری اور دوسرا مضحک کردار اور واقعاتی صورتحال۔ ان دو عناصر سے

ناول کو بہت دلچسپ اور قابل مطالعہ بنا دیا ہے۔ منظر نگاری بھی ناول کا قابلِ لحاظ پہلو ہے۔ جہاں جہاں اشرف شآد کو موقع ملا ہے، انہوں نے اپنی بیانیہ قوت اور شاعرانہ افتادِ طبع کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔ مناظر اسلام آباد سے متعلق ہوں، کراچی، استنبول یا بڈاپسٹ سے ان کے قلم میں لغزش نہیں آئی۔

اگر داستانوں کو سردست ایک طرف رکھ دیا جائے تو بھی اردو ناول کی عمر کم و بیش ڈیڑھ سو سال ہو چکی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے زمانے سے لے کر اب تک اردو ناول نے بہت موڑ کاٹے ہیں۔ بہت مراحل طے کئے ہیں اور بہت سے اسالیب کو آزمایا ہے۔ میں یہاں بھارت اور پاکستان کی تخصیص کو درمیان میں نہیں لا رہا بلکہ اردو ناول کی اس مجموعی ترقی، روایت اور تاریخ کا تذکرہ کر رہا ہوں جو گزشتہ ڈیڑھ سو برسوں میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ آج کے قاری کا ذوق اس قابلِ قدر روایت کے زیرِ اثر پیدا ہوا ہے۔ غیر ملکی ادیبوں کے فکشن نے بھی اس کی آبیاری کی ہے۔ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی فکشن کو اس سلسلے میں نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔

اس تاریخ و تناظر میں باخبر قاری کی نظر میں اشرف شآد کا بطور ناول نگار کیا مقام ہے؟ یہ سوال ابھی پیش از وقت ہے۔ وہ خوش قسمت ہیں کہ ان کے اولین ناول ''بے وطن'' کو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان کا دوسرا ناول ''وزیرِ اعظم'' نہایت توجہ سے پڑھا جا رہا ہے اور ان کے تیسرے ناول ''صدرِ محترم'' کا انتظار ہے۔

اشرف شآد کے پاس روشنی طبع ہے۔ پردوں کو چاک کر کے چیزوں کو عریاں اور اصلی حالت میں دیکھنے کا حوصلہ ہے۔ منتشر واقعات کو منظم کر کے کہانی پیدا کرنے اور اسے کہنے کی صلاحیت ہے۔ زبردست عزم اور لگن ہے۔ ان کا وژن کس نوع کا ہے؟ ان کے ہاں جاری و ساری تخلیقی عمل چیزوں کی سطح سے نیچے اتر کر اپنے اظہار میں کس درجے کی فنی تہہ داری اور پیچیدگی پیدا کرتا ہے؟ ہم عصریت اور آفاقیت میں کیسا تال میل قائم کرتا ہے؟ یہ معاملات فی الحال غور طلب ہیں۔

(ہالی ڈے ان اسلام آباد میں ''وزیرِ اعظم'' کی تقریبِ رونمائی کے موقع پر پڑھا گیا۔ ۱۹۹۹ء)

ابدی صداقتوں کی زبان

حمایت علی شاعر

اشرف شاد نے اجتماعی المیے کے ساتھ انفرادی تجربات کے تحت شیریں اور تلخ محسوسات بھی رقم کیے ہیں۔ یہ تجربہ مجازی حقیقت سے خوف زدہ ہو کر عشق حقیقی کی گود میں پناہ نہیں ڈھونڈتا۔ شاد نے محبت کی ماورائیت کو زمین کی صداقت کے ساتھ نمٹا ہے۔ شاعری کی زبان ابدی صداقتوں کی زبان ہوتی ہے۔ اور اس زبان میں شاد کو کسی حد تک قدرت حاصل ہے۔

(کراچی ۱۹۹۶ء)

اشرف شاد کا 'بے وطن'

پروفیسر سحر انصاری

اردو میں بڑے ناول کا تو کیا اچھے ناولوں کا بھی اچھا خاصا کال ہے۔ اس کے اسباب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہیں اور جب سے ناول یا فکشن پر بعض ناقدین نے سنجیدگی سے توجہ دی ہے اس مسئلے پر بھی برابر غور کیا جاتا رہا ہے۔ ڈرامے کی صنف کے لیے تو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے لکھ دیا ہے کہ یہ فطرت کا عطیہ ہے، کسی قوم کو فیاضی کے ساتھ ملا ہے اور کوئی قوم اس سے بالکل ہی محروم رہی ہے۔ لیکن ناول کے باب میں اب تک کسی نے ایسا کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا ہے۔ بعض افراد کی یہ رائے ہے کہ غزل زدہ معاشرے میں چونکہ رزمیہ (EPIC) لکھنے کی کوئی روایت نہیں ہے اس لیے مختصر اصناف ادب میں تو اس کے تخلیق کاروں کا جی لگتا ہے لیکن بڑے کینوس پر تصاویر بنانے کا رجحان نہیں ملتا۔ یہاں منی ایچر (Miniature) کی روایت کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ یہ بات جزوی طور پر تو درست ہوسکتی ہے لیکن جب ہم اردو کی کلاسیکی داستانوں، مثنویوں اور مرثیوں کی طوالت پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ مفروضہ صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ پھر جاپانی ادب ہی کو لے لیجیے یہاں ہائیکو (Haiku) جیسی مختصر نظم کا صدیوں سے رواج ہے لیکن جدید ناول میں اس نے وہ مقام پیدا کیا ہے کہ نوبل انعامات تک سے نواز دیا گیا ہے۔

ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے ایک نقاد نے لکھا ہے کہ ناول بیشتر ایک ناول نگار کی Personal Idiosyncracies کا مجموعہ ہوتا ہے۔ میں اس فقرے کے دوسرے لفظ سے متفق نہیں ہوں لیکن پہلے لفظ سے ایک اشارہ ضرور ملتا ہے کہ ناول نگار کی ذاتی زندگی کو ہمہ جہت ہونا چاہیے۔ اس

کی زندگی گوناگوں تجربات سے جس قدر معمور ہوگی اسی قدر ناول میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوگی۔ پھر اب ناول بھی ایک طویل تحقیقی مقالے سے زیادہ تحقیق، دستاویزی چھان بین، تاریخی شعور، وسیع مطالعے، شش جہتی مشاہدے اور ایک مستحکم نظریۂ حیات کا متقاضی ہوتا ہے۔ ٹالسٹائے، ایمل زولا، ہرمن میل ول، ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی بات الگ رہی خود ہمارے یہاں 'آگ کا دریا'، 'کارِ جہاں دراز ہے'، 'جانگلوس' اور 'راجا گدھ' اپنے اپنے مصنفوں کے شعور، محنتِ شاقہ اور حوصلہ مندی کا آئینہ ہیں۔

اس پس منظر کے ساتھ ساتھ اردو کے چند تازہ ترین ناولوں، 'معتوب'، 'راکھ'، 'نادار لوگ' اور 'بہاؤ' کا جب میں مطالعہ کر چکا تو مجھے اشرف شادؔ کے ناول 'بے وطن' کی نوید ملی۔

اشرف شادؔ کو میں اچھی خاصی مدت سے جانتا ہوں۔ اپنی طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ ایک ذہین، فعال اور باشعور نوجوان رہے ہیں۔ ان کے سماجی اور سیاسی نظریات سائنسی بنیادوں پر استوار ہیں اس لیے تغیراتِ زمانہ کے باوجود ان کے نظریات پر وقت کی دھول جمی نہیں ہے۔ وہ ایک خوش اسلوب شاعر ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ 'نصاب' گزشتہ سال شائع ہو چکا ہے۔ صحافت اور الیکٹرانک میڈیا سے ان کا تعلق دیرینہ ہے۔ اور ادھر کئی برسوں سے وہ آسٹریلیا میں مقیم ہیں۔ اس اثنا میں انہوں نے دنیا کی خوب سیر کی۔ ان کی شعور کی آنکھ انہیں افراد و اقوام، بازار و ممالک میں لے جاتے ہوئے وہ مناظر بھی دکھا لائی جو سطح پر نہیں بلکہ کسی شہرِ مدفون کی طرح تہہ بہ تہہ رموز میں جاگزیں ہوتے ہیں۔ اور یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب آدمی اپنے وطن اور حوالے کی سرزمین سے دور ہوتا ہے تو اسے وطن کو سمجھنے، دیکھنے اور تجزیہ کرنے کا اچھا موقع میسر آ جاتا ہے۔ اپنے وطن اور دوسرے ممالک کے مابین موازنے کا ایک خودکار ذہنی عمل شروع ہو جاتا ہے جس کے لیے کسی شعوری کوشش یا نیتِ دانستہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔

ناول کی متعدد اقسام معرضِ وجود میں آ چکی ہیں۔ جو نہیں آئی ہیں ان کا اندازہ انتظار حسین کے ایک قول سے ہو سکتا ہے۔ میں نے ایک نجی محفل میں انتظار حسین سے، جب ان کا ناول 'بستی' شائع ہی ہوا تھا، یہ کہا کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ کا ناول 'بستی' ناول کی تکنیک پر پورا نہیں اترتا۔

'تو کیا ہوا؟' انتظار حسین نے کہا۔ 'اسی سے ناول کی ایک نئی تکنیک کا آغاز ہو جائے گا'۔

چنانچہ میں اشرف شاد کے ناول کی تکنیک یا نوع کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہوں گا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ بنیادی طور پر یہ ناول پاکستان کے بارے میں ہے اور نفسیاتی، رومانی، جنسی، سائنسی، تاریخی ناول سے الگ یہ ایک سیاسی ناول ہے اور اگر اس اصطلاح کے ماننے میں کوئی تامل ہو تو اسے محض سیاسی نہیں بلکہ سیاسی شعور کا ناول کہا جاسکتا ہے۔

اس ناول کا آغاز بالکل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح ہمارے یہاں سیاسی انقلاب آتے رہے ہیں۔ سیاسی فیصلے ہوتے رہے ہیں۔ سیاست دان، سرمایہ دار، بیوروکریٹ اور جاگیرداروں کا ایک ملا جلا کھیل ہے۔ کرکٹ کی طرح اس سیاسی کھیل کی ہار جیت کے بھی کئی زاویئے اور عوامل ہیں۔ کبھی اس کا سہرا بولر کے سر بندھتا ہے، کبھی فیلڈر اور بلے باز کے اور کبھی وکٹ کیپر اور ریفری کا بول بالا ہو جاتا ہے۔ اس سیاسی کھیل میں بھی سیاست دان، سرمایہ دار، بیوروکریٹ اور جاگیردار میں سے جس کا بھی داؤ چل جاتا ہے وہ 'قومی ترقی' اور 'ملکی خدمت' کا ایک نیا نعرہ لے کر زمامِ اقتدار سنبھال لیتا ہے۔

فیلڈ مین (Feldman) نے جو پاکستان کے بارے میں اپنی کتاب From Crisis to Crisis (بحران سے بحران تک) کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے ہیں، پاکستان میں حکومت سازی کا جو نسخہ لکھا ہے وہ ہر دور پر صادق آتا ہے۔

اشرف شاد نے کسی مستعار نقطۂ نظر یا جذباتی ردوقبول کے مراحل سے گزر کر اپنے ناول کی بنیاد نہیں رکھی ہے بلکہ پاکستان کی سیاست، معیشت، تصورِ اقتدار اور روزمرہ کے انفرادی و اجتماعی تجربات کو انہوں نے جس طرح دیکھا اور محسوس کیا ہے، کرداروں اور واقعات کی مدد سے انہیں قلم بند کر دیا ہے۔ اشرف شاد خود پوری طرح اس ناول میں شامل ہیں کیونکہ اس کے بغیر ناول میں وہ توانائی، تحرک، زندگی کا شعور اور واقعیت پسندی نہیں آسکتی تھی جو اس ناول کا خاصہ ہے۔

ناول کے ایک کردار صدیقی صاحب کے حوالے سے اُن عوامل کا جائزہ لیا گیا ہے جو ایک ذمہ دار اور ایمان دار سرکاری افسر کو دل برداشتہ کرسکتا ہے جو سلیم جیسے نوجوانوں کو ترکِ وطن پر آمادہ کرتے ہیں۔ سلیم سڈنی پہنچ جاتا ہے۔ وہاں کی اپنی ایک الگ دنیا، الگ کردار اور جداگانہ تصورِ اقدار و معیارِ حیات ہے۔ سڈنی میں ایوان ہے جو ڈیوڈ کی بے وفائی کا زخم کھا کر سلیم سے وفا کرنا چاہتی ہے۔ اور اسی ماحول میں سعیدہ، ظہور اور چودھری انور اینڈریو اور باربرا جداگانہ مزاج اور

وسائل رکھتے ہیں۔

بڑے کینوس کے ناول میں کئی کردار اور کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ایک چابک دست ناول نگار ان کہانیوں کو باہم مربوط کر کے ایک وحدتِ تاثر میں بدل دیتا ہے۔ 'بے وطن' میں یہی وحدتِ تاثر اہمیت رکھتی ہے۔ اسی لیے اس ناول میں معاشیات، سیاست، جنس، طبقاتی کشمکش اور انسانوں کے خمیر و ضمیر کے گوناگوں مرقعوں کے باوجود مجھ پر یہی تاثر قائم ہوا کہ 'بے وطن' سیاسی شعور کا ناول ہے۔ اس میں کردار اور کہانیاں ہی مختلف نہیں ہیں بلکہ شہر اور ملک بھی مختلف ہیں۔ پاکستان، بھارت، آسٹریلیا، بحرین، کویت۔ اُن سب کے طرزِ حیات مختلف ہیں۔ مسائل جداگانہ ہیں اور ایک اجنبی، پردیسی یا بے وطن کو ان میں گزر بسر کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے اُس کا حیاتی سطح پر اظہار ہوا ہے۔ کیونکہ بے وطن اپنی مجبوریوں کی وجہ سے بے وطن ہوا ہے، اس کا مسئلہ کسی گروہی مہاجرت سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔ یہ ایک فرد کا فیصلہ ہے اور اس فیصلے کے پیچھے وہ حالات اور وہ سیاسی و سماجی عوامل ہیں جن سے گریز ممکن نہیں۔ یہ ایک زنجیرِ جبر کی طرح اس کے وجود اور احساس کو جکڑے ہوئے ہیں۔ اُس کے فیصلے گردوپیش کے ماحول سے نبھانے اور کبھی اس سے بغاوت کرنے پر اکساتے ہیں۔ یہ ایک ایسے فرد کی داستان ہے جو بڑے دکھ کے ساتھ کہہ سکتا ہے ؎

وصل و فراق نیک و بد، گردش صد ہزار و صد
تجھ کو کہاں کہاں مرے سرو کمال لے گئی

'بے وطن' کا ہر ملک اپنے ایک خاص سیاسی نظام کا پابند ہے۔ اس کے افراد میں ہوسِ زر، مافیا اور زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کے اپنے اپنے دائرے ہیں۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو ان سب کا سلسلہ آخری تجزیئے میں سیاسی ہتھکنڈوں سے ہی جا ملتا ہے۔

جرمنی کے مشہور ناول نگار اور دانشور ٹامس مان نے کہا تھا کہ دورِ جدید کے عام انسان کی تقدیر سیاسی اصطلاحوں میں لکھی جاتی ہے۔ مان کے اس قول کے آئینے میں 'بے وطن' کے کرداروں اور واقعات کی معنویت اور واضح ہونے لگتی ہے۔

'بے وطن' میں اشرف شاد نے انتہائی تلخ اور سنگین حقائق کے ساتھ ساتھ فینٹسی کا بھی سہارا لیا ہے اور جدید انداز میں الٰہ دین اور اس کے چراغ کے ذریعے دنیا کے ممکنہ معاملات کا ایک خیالی لیکن حقیقت آمیز جائزہ لیا ہے، جس سے ایک بار پھر دنیا کے کئی سربستہ رازوں کے چہروں سے

نقاب اٹھنے لگتے ہیں۔ اشرف شآد نے بہت حوصلے، بے باکی، شعور اور فنی گرفت کے ساتھ اپنے ناول 'بے وطن' کا تانا بانا بنا ہے۔ اس میں جو واقعات ہیں انہیں آج کی دنیا کا کوئی بھی سیاح اپنے سفرناموں یا رپورتاژ کا حصہ بنا سکتا ہے لیکن اشرف شآد کا ناول یہ فیصلہ کرنے میں بڑی مدد کرتا ہے کہ اس قسم کی تحریروں اور ناول میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ناول کی تعمیری کلیت (Architechtonic whole) اپنے چند خاص فنی، تخلیقی اور وجدانی عناصر کی متقاضی ہوتی ہے جن کے بغیر وہ واقعات بھی جو حقائقِ حیات پر مبنی ہوتے ہیں پوری طرح گرفت میں نہیں آسکتے۔ اشرف شآد نے 'بے وطن' میں ایک ناول کی تکمیل کی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس میں ایک اہم ناول نگار چھپا ہوا تھا جو اپنے تخلیقی کرب کے حوالے سے خود ہی ظاہر ہوا اور اپنی صلاحیتوں کو منوا لے گیا۔ 'بے وطن' اردو کے جدید ناولوں میں ایک دلکش اضافہ ہے۔

(۱۹۹۷ء)

جانے پہچانے کردار

عبیداللہ بیگ

اس بیان میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اشرف شاد کا ناول بے وطن اتنا دلچسپ ہے کہ اسے ایک بار شروع کرنے کے بعد چھوڑ نا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا۔ اس کے دلچسپ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اگر کسی کہانی، افسانے یا ڈرامے میں ایسے کردار ہوں جنہیں آپ پہچانتے ہوں، جنھوں نے آپ کی زندگی پر براہ راست یا بالواسطہ اثر ڈالا ہو، آپ کی زندگی بنانے بگاڑنے میں اہم کردار ادا کیا ہو تو آپ اُس کہانی افسانے اور ڈرامے میں گہری دلچسپی لیں گے۔ کرداروں کی یہی شناخت ہے جسے اشرف شاؔد جیسے معتبر اور سچے صحافی کی اضافی معلومات نے ناول کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس ناول کا ایک ایک کردار پہچانا جاتا ہے اوران کے بارے میں یہ اضافی معلومات نہ صرف ہمارے علم میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ مستقبل کی راہوں میں احتیاط کا بھی سبق دیتی ہیں۔

(کراچی ۱۹۹۷ء)

اشرف شاد کے ناول کا سب سے بڑا سچ

زاہدہ حنا

اردو نثر کو جدید قالب عطا کرنے والے غالب نے کہا ہے کہ ''داستان سرائی من جملہ فنون سخن ہے۔'' اردو تہذیب کے اس عالی جناب وعزت مآب نے یہ کہا تو کیا غلط کہا کہ وہ اور اس کی نسل اور اس سے پہلے گزرنے والے داستان طلسم ہوشربا اور داستان امیر حمزہ، ایرج نامہ وتورج نامہ اور کوچک باختر و بالا باختر کے پالے اور ڈھالے ہوئے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جب غالب نے آنکھیں موندیں اور انگریزی زبان کے وسیلے سے اردو میں ناول کا چراغ جل اٹھا تو بیشتر نے اسے اپنی داستانوں کا نیا روپ بہروپ جانا۔

انیسویں صدی کے ڈپٹی نذیر احمد اور رشید النساء کے تمثیلی قصوں سے اب اشرف شاؔد کے ناولوں تک حساب لگایئے تو یہ عین مین ایک سوتیس برس کا قصہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی ''مراۃ العروس'' 1869ء میں طبع ہوئی اور ''وزیراعظم'' کو 1999ء میں چھاپے کی سیاہی لگی۔ ڈپٹی نذیر احمد، اکبری اور اصغری کا، محمد عاقل اور محمد کامل کا قصہ لکھ رہے تھے، اشرف شاؔد نے مرینہ شاہ اور مسز چنائے کی کہانی لکھی ہے، آصفہ اور رضا توصیف کے معاملات کو کہانی کے رنگ میں بیان کیا ہے۔

میرے خیال میں صحافی جب ادب کے میدان میں اترے تو اسے کسی اور سے نہیں خود اپنے آپ سے ڈرنا چاہیے۔ اس لیے کہ یوں تو ادیب اور صحافی دونوں ہی قلم کی مزدوری کرتے ہیں لیکن صحافت قلم کی وہ مزدوری ہے جو عموماً پیشانی کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہتھیلی پر رکھ دی جاتی

ہے جبکہ ادب کارِ فرہاد ہے۔ ادیب بے ستوں بھی تراشتا ہے اور بجائے اس کے کہ عوضانہ میں شیریں ہاتھ آئے، خود اپنی جان سے جاتا ہے۔

اشرف شاؔد ہمارے دوست، ہمارے ساتھی ہیں، کراچی چھوڑ کر سڈنی جا بسے ہیں تو کیا، ان کی جان ہمیں بہت عزیز ہے، اس لیے ان کا ناول پڑھ کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے تیشۂ فرہاد کی بجائے تیغۂ جلاد اٹھایا ہے اور خسروانِ پاکستان کا ستھراؤ کرتے چلے گئے ہیں۔

''وزیراعظم'' کے تمام کردار ہمارے جانے پہچانے ہیں، اشرف شاؔد نے ان کے نام بدلنے کا تکلف جانے کیوں کیا ہے؟ شاید اس لیے کہ یہ ہر سال دو سال پر پاکستان کا پھیرا لگا سکیں، یہاں سے ''وزیراعظم ادبی ایوارڈ'' اور دوستوں کی داد سمیٹ کر لے جا سکیں۔ یہ کئی برس سے مغرب میں ہیں، وہاں مقبول عام ناولوں کے مصنفوں کا یہی چلن اور یہی وتیرہ ہے۔ انہوں نے مغرب کے اس رنگ کو اردو میں بڑے سلیقے سے برتا ہے اور پاکستانی سیاست کے گندے نالے کا میورل ہلکے اور گہرے رنگوں میں بناتے چلے گئے ہیں اور اپنے ایک کردار رحمانی کے بقول ''اخبار نویس نہیں تاریخ نویس بن گئے ہیں''۔

پاکستانی قوم آج سے نہیں اپنی ابتدا سے بھٹکنے کے عمل سے دوچار ہے۔ شاید اس لیے کہ بقول اشرف شاؔد ''تاریخ فتوحات سے مزین ہو یا شکستوں کا ٹوٹا ہوا آئینہ، اچھی ہو یا بری، اس کی جڑیں صدیوں گہری ہوں تو وہ اپنی زمین پر رہنے والوں کے قدم مضبوطی سے تھامے رہتی ہے، جن کی تاریخ مختصر ہو انہیں بہت بھٹکنا پڑتا ہے''۔

اسلام آباد میں ایک شاہراہِ جمہوریت ہے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اشرف شاؔد کا ایک کردار کہتا ہے ''شاہراہِ جمہوریت ہمیں راس نہیں آتی، اس پر جگہ جگہ مارشل لاء کے بمپ آئیں گے''۔

ان کا قلم پاکستان کا نقشہ کس چابک دستی سے کھینچتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

''پاکستان میں سیڑھیاں چڑھنا آسان نہیں ہے، بہت بھیڑ ہوتی ہے، بہت دھکے دینے پڑتے ہیں، بہت زور لگانا پڑتا ہے، تب ایک سے دوسری سیڑھی کا سفر طے ہوتا ہے''۔

اشرف شاؔد نے یہ نہیں لکھا کہ پاکستان میں ذہانت اور دیانت کو سیڑھیاں چڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا، ان کی ٹانگیں گھسیٹ کر انہیں ایک کنویں میں ڈال دیا گیا ہے اور سماج کے سب سے زیادہ

گند ذہن اور بد دیانت افراد اس کنویں میں منہ ڈال کر صبح وشام ذہانت اور دیانت کو احمق ہونے کا، نااہل اور نالائق ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ یہ طعنہ اتنی مرتبہ دہرایا جاتا ہے کہ ہر دیانت دار اور ذہین شخص اپنے آپ کو واقعی نااہل، نالائق اور احمق سمجھ کر سر جھکا لیتا ہے اور زندگی کی تہمت پوری کرتا رہتا ہے، بغاوت کے اور انقلاب کے خواب نہیں دیکھتا، نااہلوں اور بد دیانتوں کو سیڑھیوں سے گھسیٹ کر اتارنے کی جرأت نہیں کرتا۔

اسی کم ہمتی اور لاچاری سے پیدا ہونے والی تلخی ان کے ایک کردار سے کہلواتی ہے۔ ''بڑے صاحب، تھالی اب چھلنی ہوگئی ہے، نیا سوراخ کرنے کی جگہ نہیں بچی''۔

ذہین جلالی ''وزیر اعظم'' کا بنیادی کردار ہے، ایک ایسا صحافی جو سچ کی تلاش میں ہے، امید کی سوداگری کے خواب دیکھتا ہے۔ جو اردو صحافت سے انگریزی صحافت کی طرف مراجعت کرتا ہے، جس کی لکھی ہوئی تحریریں اور تجزیئے صدر محترم، وزیر اعظم، امیر و وزیر و سفیر پڑھتے ہیں، جس کا خیال ہے کہ دوسرے اسٹیبلشمنٹ کے آدمی ہیں تب ہی وہ چیخ کر کہتا ہے کہ ''سچ لکھنے کے لیے لائسنس کی نہیں جرأت کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے اور آپ کے یہ دوست پناہ حاصل کئے بغیر سچ لکھنے کی ہمت نہیں کرتے، سب نے اپنی اپنی پارٹی چن لی ہے۔ وہ ایک پارٹی کی پناہ میں رہ کر دوسری پارٹی کی حکومت کے خلاف لکھنے کو جہاد سمجھتے ہیں اور جب ان کی حمایت کردہ پارٹی کی حکومت آتی ہے تو اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن جاتے ہیں۔''

اشرف شآد کے اس ناول کا سب سے بڑا سچ یہی ہے کہ ہم سب نے اپنی جرأتیں اپنی جرابوں میں رکھ لی ہیں اور کسی نہ کسی طور اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن چکے ہیں۔ یہ ہمارے وقت کا سب سے بڑا سچ ہے کہ ہمارے دانشوروں کو نوکر شاہی میں اعلیٰ مراتب و مناصب کے حصول کا شوق ہے، جس سماج کے دانشور منافق اور مصلحت پسند ہو جائیں، وہ سماج مر جاتا ہے اور پھر اس میں شور مچانے والے دانشور زندہ رہتے ہیں، سماج کو لوٹ کر کھا جانے والے جرنیل، وزرائے اعظم، صدور اور ان کے مصاحب زندہ رہتے ہیں، نائکائیں اور قبائیں زندہ رہتی ہیں، اسلحے کے تاجر، بڑے صنعت کار اور بینکار زندہ رہتے ہیں' تاکہ مرتے ہوئے سماج کے ڈھانچے پر رہ جانے والی آخری بوٹیاں بھی نوچ کر کھائیں اور پھر وہ ٹکٹ پر ان شہروں کو پرواز کر جائیں جہاں سے انہیں کوئی طاقت واپس نہیں لاسکتی، ان کا احتساب نہیں کرسکتی اور ایک زندہ اور نمو پذیر سماج کے قتلِ عمد کا ان پر

مقدمہ نہیں چلاسکتی۔

اس ناول کے مرکزی کردار ذہین جلالی کا نام شکیب جلالی سے مستعار لیا گیا ہے، شکیب جلالی نے خودکشی کی تھی، میرے خیال میں ذہین جلالی نے بھی اپنی تمام ذہانتوں اور اپنے سینے میں پلتی ہوئی بغاوتوں کے باوجود آخرکار اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن کر خودکشی کی۔ ایک ایسی خودکشی جس کے نتیجے میں پوسٹ مارٹم نہیں ہوتا، لاش مردہ خانے میں نہیں رکھی جاتی اور آخرکار کسی قبرستان میں دفن نہیں ہوتی۔

میرے خیال میں اشرف شاد کا یہ وہ کردار ہے جسے انہوں نے پوری قوت سے لکھا ہے اور ان باغی اور مضطرب نوجوانوں کے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے جو اسٹیبلشمنٹ کے ڈریکولا کو ہلاک کرنے نکلے تھے اور آخرکار اسی کا شکار ہو کر اس کے ہمزاد ہوئے۔

''وزیراعظم'' کو پڑھتے ہوئے مجھے کئی مرتبہ ''باغ و بہار'' کا خیال آیا۔ باغ و بہار یوں تو بادشاہوں اور بادشاہ زادوں، شہزادیوں اور وزیرزادیوں کا قصہ ہے اس کے باوجود ایک نقاد کے بقول اس کے ''بہترین عناصر پر شہزادوں اور شہزادیوں کی حکمرانی نہیں بلکہ عام آدمی کا پھریرا لہراتا ہے''۔

''وزیراعظم'' کو جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو یہی خیال تھا کہ اشرف شاؔد ایک دل جلے صحافی رہے ہیں، انہوں نے اگر وزیروں، امیروں، سفیروں کو بہت قریب سے دیکھا ہے تو عامیوں کے بھی نباض اور رمز شناس ہیں، اور کیوں نہ ہوں کہ خود ان ہی میں سے ہیں۔ اس کے باوجود وزیراعظم کے صفحوں پر مجھے عامیوں کا پھریرا اڑتا ہوا نظر نہیں آیا۔ مانا کہ اس میں چوکیدار اور چوبدار بھی ہیں، خانساماں اور خدمتگار بھی، کلو چاچا، بشیر پان والا، وحید بھنڈی اور دین محمد بلوچ بھی، لیکن یہ ''وزیراعظم'' کے اسٹیج پر آنے والے اور لمحہ بھر کے لیے اپنی چھب دکھا کر گزر جانے والے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کردار آپ کے سینے میں اپنے پنجے گاڑ کر اور وجود میں نقب لگا کر نہیں بیٹھ جاتا۔ یہ چھوٹے چھوٹے غیر اہم کردار دروازے کی چوکھٹ میں دیمک کی بنائی ہوئی درز میں سلگتی ہوئی اس اگربتی کی طرح ہیں جو راکھ بن جائے تو اس کی خوشبو بھی خاک میں مل جاتی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی عامی کردار وہ نافہ مشک نہیں کہ جسے اپنے وجود میں سمیٹ کر رکھنے والا شیشہ اس سے خالی ہو جائے تب بھی جگ اس کی خوشبو سے مہکتا رہتا ہے۔

اشرف شاد کو مبارک باد دینی چاہیے کہ انہوں نے پہلے ''بے وطن'' لکھا، پھر ''وزیر اعظم'' پر خنجر تیز کیا اور اب ''صدر محترم'' کے بخیے ادھیڑ کر ہمارے سامنے رکھنے والے ہیں۔ سڈنی کی سرزمین اگر تخلیقی اعتبار سے اتنی ہی زرخیز ہے تو آئیے قطار بنائیے، جس طرح اشرف شاد کے دن پھرے، شاید ہمارے بھی پھر جائیں۔

(2 ستمبر 1999ء کو آرٹس کونسل کراچی میں ''وزیر اعظم'' کی تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)

خوش گوار فریضہ

احمد شمسی

شاعری کو ہم اشرف کا محض ایک رومانی شوق سمجھتے تھے۔ محفل میں بیٹھ کر خود کو شاعر ظاہر کرنا اشرف کو کبھی پسند نہیں آیا۔ کبھی بہت اصرار ہوا تو ایک غزل گنگنا دی۔ خوبصورت ترنم ہلکی سی نشہ آور شام کا تاثر چھوڑ جاتا۔ لیکن ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو کر اشرف نے نصاب کی شکل میں جو گلدستہ ترتیب دیا ہے اس نے حیران کر دیا ہے۔ لیکن حیرت اپنی جگہ، اپنا ناظمِ نشر و اشاعت ہونا میں اب بھی نہیں بھولا ہوں۔ نصاب کی اشاعت کا فریضہ آج بھی میرے ہی ذمے ہے۔ یہ خوش گوار فریضہ، دوستی کا یہ ورثہ مجھے آج بھی بے حد عزیز ہے۔

(کراچی ۱۹۹۶ء)

اشرف شاد: خبر نگاری سے ناول نگاری تک

اطہر ندیم

یہ ضروری نہیں کہ آپ جن سے محبت کرتے ہوں ان کے بارے میں ہمہ وقت سوچتے بھی رہتے ہوں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ رشتۂ محبت اس وقت بھی قائم ہو دائم ہوتا ہے جب ہم ان کے بارے میں سوچ نہیں رہے ہوتے۔ مگر اشرف شاد کو معاملہ چانس پر چھوڑنے کی عادت نہیں۔ وہ سال چھ مہینے کے بعد ہمیں اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا رہتا ہے، اس معاملے کو بھی ہمارے ارادوں پر چھوڑ رکھنے کا قائل نہیں۔ کرۂ ارض کے دوسرے کنارے کے ایک شہر سڈنی سے کسی دن اچانک اس کا فون آئے گا اور مجھے نئی حیرت میں چھوڑ کر بند ہو جائے گا، یا مظہر العجائب اس شخص کی کتنی پرتیں ہیں۔ اس کے اندر کی تخلیقی توانائی کتنے رخ اور اختیار کرنے والی ہے۔ خبر نگاری سے جو سفر شروع کیا اسے ناول نگاری تک تو لے آیا ہے۔ درمیان میں شاعری کا دورہ بھی پڑا۔ میرے لیے تو یہی حیرت کیا کم تھی کہ جب اس نے بتایا کہ اس کی شاعری کی کتاب شائع ہو گئی ہے جس کی تقریب کے لیے پاکستان آ رہا ہوں۔ لاہور بھی آؤں گا مگر وہ لاہور نہیں آیا اسلام آباد میں قیام ذرا طول پکڑ گیا اور وہیں سے کراچی چلا گیا۔ میرے لیے شاعری کی خبر اس لیے حیران کن تھی کہ کویت میں قیام کے دوران اس نے صرف اتنا ذکر کیا کہ کسی زمانے میں چند اشعار کہے تھے۔ میرے لیے یہ بات قابلِ فہم تھی کیونکہ میں اپنے علاوہ کئی اور صحافی دوستوں کا حشر دیکھ چکا تھا کہ صحافت ذہنی صلاحیتوں کا رخ اپنی طرف اس طرح کر لیتی ہے کہ پھر اُسے اِدھر اُدھر نظر پھیرنے نہیں دیتی، یوں کہنا چاہئے کہ ہمیں دبوچ رکھتی ہے۔ ہمارے بزرگ دوست اور بھائی حمید اختر

صاحب کا حشر بھی سامنے تھا کہ صحافت سے عقد نکاح سے پہلے اچھی بھلی افسانہ نگاری کرتے تھے۔ اس عفیفہ کے ساتھ رہنے لگے تو افسانہ نگاری گئی تو اس کے بعد 35 سال کے بعد افسانہ لکھا وہ بھی اس وقت جب انہیں اس کوچے سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔

میں بھی کالج کے زمانے سے برے بھلے شعر کہنے لگا تھا۔ مگر اس پیشے میں آیا تو شاعری سے دوری ہوتی گئی۔ کبھی کبھار ہی اس گلی کا پھیرا لگا کرتا۔ چنانچہ میں نے اندازہ کیا کہ اشرف شاؔد پر بھی یہی گزری ہوگی۔ مگر انہوں نے وہاں ابھی دو چار مشاعروں ہی کو سونگھا ہوگا کہ اِکا دُکا غزلوں کی آمد شروع ہوئی۔ پھر انہوں نے اپنے اندر ایک عدد ترنم بھی دریافت کر لیا، مگر اس سلسلے نے زیادہ زور نہیں پکڑا وجہ وہی صحافت جو وہاں بھی ان پر قبضہ جمائے تھی۔ مگر سڈنی سے جب انہوں نے مجموعۂ کلام ''نصاب'' کی اشاعت کی خبر دی تو حیرت کے ساتھ مجھے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ صحافت سے رہائی کے بعد اب اس کی تخلیقی توانائی نے یہ راستہ پکڑ لیا ہے، مگر اس وقت بھی مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ کبھی ناول نگاری کی طرف چل نکلے گی۔ شاعری کو تو جز وقتی طور پر نبھایا جا سکتا ہے اور اکثر شاعروں کا تعلق شاعری سے جز وقتی ہی ہوتا ہے۔ کل وقتی شاعر مشکل ہی سے ملیں گے جو پورا وقت شاعری کو دیتے ہوں اور ان کے لیے یہی وسیلۂ رزق ہو، مگر ایک بات مجھ پر بالکل واضح تھی کہ چونکہ اشرف شاؔد نے شاعری شادی کے کئی سال بعد کی ہے اس لیے اس کے سچا شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اسے ''درختوں پر نام لکھنے'' کے دور کے شاعروں میں شمار نہیں کیا جا سکتا جو شادی کے بعد گھرداری کے ہی ہو کے رہ جاتے ہیں اور شاعری کی فاختہ کہیں اور گھونسلہ بنا لیتی ہے۔

مگر اگلے سال جب اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ اس کا ناول ''بے وطن'' شائع ہو گیا اور ''تمہارے پتے پر تمہیں بھیج رہا ہوں'' تو اس نے مجھے واقعی حیرت زدہ کر دیا۔ یہ خبر بڑی اچانک تھی کیونکہ ناول نگاری کے آثار موصوف میں پہلے کبھی دکھائی نہیں دیے، روداد نگاری البتہ تھی۔ ان کے بارے میں اتنا پتہ چلا تھا کہ وہ علم کی پیاس بجھانے میں لگے ہوئے ہیں اور پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ تحریر کرنے کی تیاریوں میں ہیں اور جب کوئی پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھتے لکھتے یک بیک ناول لکھنا شروع کر دے تو آپ حیرت زدہ نہیں ہوں گے تو اور کیا کریں گے۔ اور پھر اس نے بے وطن کی خبر سناتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ نیا ناول وزیراعظم، تقریباً آدھا مکمل ہو چکا ہے تو بس ایک دو مہینوں میں یہ بھی مکمل ہو جائے گا تو حیرت در حیرت کا معاملہ ہو گیا۔ جیسا کہ بے وطن کے بارے

میں سمیع آہوجہ کا کہنا ہے کہ اس میں پلاٹ در پلاٹ ہیں۔

اشرف شاؔد ہفت اقلیمی ہے۔ کہانیوں میں تو ہفت اقلیم کے بادشاہ ہوا کرتے تھے یہ ہفت اقلیم مسافر ہے، مگر اس کا کمال ہے کہ ہر جگہ اس نے زندہ آدمی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ہر جگہ اس نے ''اپنی دنیا آپ پیدا کرنے'' کی کوشش کی ہے۔ جس ماحول میں بھی رہا اس کا حصہ بن کر نہیں رہا بلکہ اس نے وہاں حتی الامکان اپنی دنیا بسانے کی کوشش کی۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ اس نے کوئی سیاسی اور سماجی انقلاب لانے کی کوشش کی بلکہ میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ چپ چاپ دوسروں کی ثقافت کا حصہ بنے رہنے کی بجائے اپنے ثقافتی وجود کو زندہ رکھنے اور اپنی شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے تگ و دو کی۔ نیویارک کے بارے میں تو میں زیادہ نہیں کہہ سکتا مگر بحرین، کویت اور اب سڈنی میں اس کی سرگرمیاں اس نصب العین کے گرد گھومتی رہیں۔ یہی ایک زندہ آدمی کی نشانی ہوتی ہے۔ مردہ لوگوں کو تو جس ماحول میں رکھا جائے چپ چاپ پڑے رہتے ہیں۔ وہ بلا چوں و چرا اسی کا حصہ بن جاتے ہیں، مگر زندہ انسان اپنا وجود منواتا ہے اور ماحول میں اپنی طرح ڈھالتا ہے۔ اپنی مادی دنیا بھی خود تخلیق کرتا ہے۔

ڈھائی ہزار سال پہلے ارسطو نے فکشن کو ہسٹری پر اس بنا پر ترجیح دی تھی کہ ہسٹری میں چیزوں کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے جیسے کہ وہ ہیں۔ مگر فکشن میں انہیں ایسے پیش کیا جاتا ہے جیسے کہ وہ ہوسکتی ہیں یا انہیں ہونا چاہئے، گویا اس کے نزدیک ناول نگاری بھی عندلیب گلشن ناآفریدہ ٹھہرا۔ مگر ''وزیر اعظم'' پڑھتے وقت تو مجھے احساس نہیں ہوا کہ یہ کسی ناآفریدہ گلشن کی کہانی ہے۔ بلکہ مجھے تو یہ اصل کی نقل لگا، اور نقل بھی ایسی کہ جس پر یہ نہ لکھا ہو کہ کہانی کے کردار اور واقعات فرضی ہیں مماثلت اتفاقیہ ہوگی۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے کوئی جھٹکا بھی نہیں لگا۔ اس لیے کہ یہ سارے واقعات اور کردار ہمارے براہ راست تجربے میں آئے ہیں اور آئے جارہے ہیں۔ یہ روداد نگاری ہے مگر اس سوال پر بحث کسی اور وقت پر اٹھار کھتے ہیں کہ آیا ناول روداد نگاری ہے یا اس میں متخیلہ کا بھی کوئی کام ہوتا ہے۔ ویسے ناول افراد و حوادث ہی کی کہانی ہوتا ہے اور جب اس کہانی میں واقعات کی ایسی صورت پیش کی جائے جن کا تعلق گلشن ناآفریدہ سے ہو تو ایسا متخیلہ کی کارفرمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ مگر ''وزیر اعظم'' میں واقعات کی ایسی کوئی صورت سامنے نہیں آتی۔ یعنی اس میں اصل کی نقل ہیں۔ مگر مصنف نے یہ التزام کیا ہے کہ حقیقت کی ترتیب نو بھی کی ہے اور تخلیق نو بھی،

لیکن ہے یہ نقل بمطابق اصل ہی۔ اس میں فرق نہیں آنے دیا۔ مگر ناول چونکہ پاکستان کے عہد رواں کے بارے میں ہے اس لیے اسے پڑھتے ہوئے قاری کو ایک مشکل سے ضرور دوچار ہونا پڑتا ہے کہ وہ ناول کے کرداروں میں اصل کرداروں کو ڈھونڈنے لگ جاتا ہے۔ مثلاً وہ رضا سروہی، عامر نذیر، آصفہ اور ریاض توصیف وغیرہ کو پہچاننے میں کافی سر کھپاتا ہے۔ جنرل کانی کو تو خیر وہ بہت جلد جان جاتا ہے اور اس کی صحافی بیٹی سے بھی جان پہچان بہت جلد ہو جاتی ہے تاہم مصنف کی چالاکی سمجھنے میں تھوڑا وقت لگتا ہے کہ اس نے بے نظیر کا جینڈر ہی بدل دیا ہے اسے عامر نذیر بنا دیا ہے۔ اس ناول کا مطالعہ قاری کے لیے ایک انوکھا تجربہ ہے کہ ناول کے کرداروں کے اصل سے اخباروں میں اس کا روز واسطہ پڑتا ہے۔

مجھے کسی نے بتایا تھا کہ ناول میں چار عناصر کا ہونا بہت ضروری ہے تبھی ظہور ترتیب ہوتا ہے۔ ایک تو ''تھیم'' ہے اور پھر پلاٹ ہے، کردار نگاری ہے اور سب سے آخری بات مصنف کا اسلوبِ اظہار ہے۔ چونکہ بتانے والا کوئی کلاس ٹیچر نہیں تھا اس لیے یہ بات سمجھ میں بھی آ گئی۔ اس ناول کی تھیم، اقتدار مافیا ہے۔ جس نے طاقت کے سرچشموں پر قبضہ کر رکھا ہے وہ کس طرح اسے اپنی گروہی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے اور اس صورت میں ملک کے آئینی اداروں کی کیا درگت بن رہی ہے یہی اس کی تھیم ہے اور ناول کا ہیرو بھی اصل میں اقتدار مافیا ہی ہے۔ ذہین جلالی کو سائیڈ ہیرو کی حیثیت حاصل ہے۔ ہیرو کی نہیں۔ اس سارے گروہ کے کرداروں میں مصنف نے ایمان علی کے کردار کو ذرا آئیڈیالائز کرنے کی کوشش کی اور گلشن نا آفریدہ کی تعمیر کے لیے اس سے امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔

تاہم اس ناول میں تعمیر نو کی امیدوں پر اوس پڑ جاتی ہے کہ عین وقت پر اقتدار اس کے بجائے ریاض توصیف کے گھر کا رخ کر لیتا ہے۔ اس لحاظ سے ناول نامکمل ہے کہ اس میں کلائمکس نہیں۔ اقتدار انہیں غلام گردشوں میں گردش کر رہا ہے۔ اسے خطِ مستقیم پر سفر کرنا نصیب نہیں ہوا۔ عین ممکن ہے اگلے ناول جس کا نام صدر مملکت ہوگا میں ایمان علی کو بھی کچھ کرنے کا موقع دیا جائے۔ ایک نسل جو چھٹی دہائی میں جوان ہوئی اس کے خواب تو اس کی آنکھوں میں ہی خشک ہو گئے ہو سکتا ہے اگلی کسی نسل کے خوابوں کو تازگی مل جائے بشرطیکہ اسے خواب دیکھنے کی عادت پڑی ہو۔

اقتدار کے اسٹیج پر جو چہرے نظر آتے ہیں یہ محض اس ڈرامے کے کردار ہیں جو اسکرپٹ کے

مطابق اپنا اپنا رول ادا کر کے اسٹیج سے چلے جاتے ہیں۔ اس ڈرامے کی ڈائریکشن اور پروڈکشن اقتدار مافیا کے ہاتھ میں ہے اور اسکرپٹ رائٹر بھی ان کا اپنا ہے۔ اقتدار مافیا میں عسکری، بیوروکریسی، انٹیلی جنس، سول بیوروکریسی، اجارہ دار سرمائے کے علاوہ سپر طاقت کے مقامی کارندے کو نمائندگی حاصل ہے۔ مگر غالب آواز عسکری اور انٹیلی جنس کے نمائندوں کی ہے۔ سیاسی لیڈر اور سیاسی پارٹیاں سب ان کے گماشتے ہیں۔ قومی سیاست دراصل گماشتہ سیاست ہی کا دوسرا نام ہے۔ وزیر اعظم اسی کا نمائندہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ ذہنی بانجھ پن کا شکار ہیں ان کے اعمال کے محرکات اپنی ذاتی خواہشات سے ہٹ کر نہیں ہوتے اور ذات کے سفلی دائرے سے باہر نکل کر سوچنے کی ان میں صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ حرص و ہوس کے پنجرے کے قیدی ہیں اور اسی قفس میں پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں۔ اشرف شاؔد نے اسی قفس میں ان کی پھڑ پھڑاہٹ کی روداد وزیر اعظم کے نام سے لکھ دی ہے۔ اشرف شاؔد نے اس میدان میں بھی جرأت اور جدت طرازی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہاں بھی اس کی خبر نگاری اپنا کام دکھا گئی۔ اشرف شاد کو خبر نگاری سے ناول نگاری کا یہ سنہرا سفر مبارک ہو۔

(لاہور میں ہوٹل شیزان میں ''وزیر اعظم'' کی تقریب رونمائی میں پڑھا گیا۔ ۱۹۹۹ء)

اشرف شاد منفرد لب ولہجہ کا شاعر

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

چند برس کی بات ہے اشرف شاد سے میری ملاقات بحرین میں ہوئی۔ دراصل مشہور و معروف شخصیت عزیز محترم سلیم جعفری کے زیر اہتمام دبئی، ابوظہبی اور العین میں مشاعرے منعقد ہوئے تھے جن میں ہندوستان اور پاکستان سے ہم چند شعراء مدعو تھے۔ ان مشاعروں کے بعد ہم لوگ یعنی حمایت علی شاعر، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، جون ایلیا، احمد فراز، بشیر بدر، یہ خاکسار اور دو ایک اور شعراء جن کے نام اس وقت حافظے میں نہیں ہیں دبئی سے بحرین روانہ ہوئے۔ اشرف شآد وہاں کے مشاعرے کے منتظمین میں شامل تھے۔ بحرین میں ہم لوگوں کا تین چار روز قیام رہا اور اس دوران میں اشرف شآد اور بیٹی یاسمین سے خوب خوب ملاقاتیں رہیں۔

ان ملاقاتوں میں اشرف شآد صاحب کا کلام سننے کا بھی موقع ملا۔ اس وقت غالباً ان کی شاعری کی ابتدا تھی لیکن اس شاعری میں ان کی انفرادیت اپنی جھلکیوں کے ذریعے سے یہ بتا رہی تھی کہ اس شاعری کا خالق عن قریب دنیائے شعر میں اپنے لیے ایک خاص مقام پیدا کرنے والا ہے۔

اور اب جب کہ ان کے زیر طباعت مجموعۂ کلام کے چند اوراق میرے سامنے آئے ہیں تو مجھے یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی ہے کہ اشرف شآد کو رسمی انداز سے جدید شاعر یا جدید حسیت کا شاعر کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ ان کے کلام کی جدت کی ابعاد متنوع ہی نہیں ہیں بلکہ دور دور تک پہنچتے ہیں۔ ان کی شاعری کا لہجہ ماضی سے چل کے حال سے ہوتا ہوا مستقبل تک پہنچتا ہے۔

شاعری کے جدید رویوں سے اشرف شآد کی وابستگی اردو شاعری کی ایک قیمتی متاع ہے۔

صرف یہ کہنا کہ شاؔد کی شاعری قدیم و جدید کا ایک خوبصورت اجتماع ہے کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ انہوں نے اپنے حسنِ بیان کی بدولت شاعری کو نئے ذائقے سے آشنا کیا ہے۔ 'یہ مقبرہ ہے تیل کا' کے عنوان سے نظم، شاؔد نے عراق اور کویت پر امریکی اتحادیوں کی بمباری کے روز کہی۔ اس نظم کے تاثر تک پہنچنے کے لیے اس کا اوّل سے آخر تک مطالعہ ضروری ہے۔ چند مصرعوں کا حوالہ نظم کے مجموعی تاثر کا نعم البدل نہیں ہوسکتا۔

بات میں نے غزل سے شروع کی تھی۔ درمیان میں ایک نظم کا ذکر آ گیا۔ دراصل مذکورہ مجموعہ کلام کے جو چند اوراق (یا صفحات) مجھے آسٹریلیا سے موصول ہوئے ہیں ان میں نظم صرف ایک ہی ہے۔ باقی ان میں غزلیں ہیں اور ان غزلوں کا انداز و اسلوب اوّل سے آخر تک ایک ایسی تازگی اور شگفتگی کا حامل ہے جسے میں غزل کے لیے سرمایۂ حیات سمجھتا ہوں۔

ان سے ملا تو پھر میں کسی کا نہیں رہا ۔۔۔ اور جب بچھڑ گیا تو پھر اپنا نہیں رہا

یہ کیا ستم ہے کہ میں جس زمین پہ پاؤں رکھوں ۔۔۔ اسی زمین کا محور ہٹا ہوا نکلے

کتنے چراغِ حسن تمہاری گلی میں تھے ۔۔۔ تھی جس میں روشنی وہ دریچہ تو ایک تھا

یہ دور ٹھیک ہے کہ وہی درد جس میں شاؔد ۔۔۔ جمہوریت نہیں تھی خلیفہ تو ایک تھا

شوقِ جنوں یہ کیسے زمانوں تک آ گیا ۔۔۔ ہر حوصلہ تھکن کے بہانوں تک آ گیا

اک شاؔد ہی نہیں جو وطن چھوڑ کر بکا ۔۔۔ کتنے گھروں کا مال دکانوں تک آ گیا

دل کھول کر ہنسا ہے مرا زخم اس طرح ۔۔۔ رویا ہے اسکے سامنے خنجر لہو میں تر

دل میں بسا ہے شاؔد وہی شہر اب تلک ۔۔۔ جس شہر میں رہا ہے سخنور لہو میں تر

اشرف شاد کے کلام میں دلکشی، تازگی، شگفتگی، نغمگی اور تغزل نے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اس طرح ایک اکائی کی صورت اختیار کی ہے کہ اشرف شاد جدید شاعروں کے ہجوم میں (جس میں تک بندبھی خاصی تعداد میں شریک ہو گئے ہیں) ہر اعتبار سے ایک منفرد لب ولہجہ کا شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔

(سرینگر ۱۹۹۶ء)

اِک پرلہو میں تر

فہمیدہ ریاض

اشرف شاد نے آسٹریلیا سے کئی برسوں پر محیط اپنی شاعری مجھے بھیجی اور بھولی بسری یادوں کا ایک دریچہ وا کردیا۔ بھٹو دور، ہفت روزہ 'معیار' کا دفتر، نوجوانوں کی امنگیں اور خواب...... ولولے اور جذبات...... نگاہوں میں کتنے ہی چہرے روشن ہوگئے۔ کتنے ہی کردار زندہ ہوگئے۔

وہ آکے بیٹھے بھی اور گئے بھی　　نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں　　یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

اور پھر مارشل لاء کے تاریک سائے، کوڑے، جیل، جلاوطنیاں...... اشرف اس کی آندھی میں ڈال سے ٹوٹ کر بکھر جانے والے اَن گنت محبِ وطن نوجوانوں میں تھے جو اپنے مختصر خاندان کے ساتھ آسٹریلیا جا بسے۔

کتنے برس گزر گئے...... پاکستان میں اب ایک نئی نسل جوان ہوگئی۔ مگر اشرف شاؔد کی شاعری پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان کے قلم میں مٹی کی وہی بوباس اور سماجی اور سیاسی منصفی کی وہی آرزو آج بھی زندہ ہے جس نے ان کی نسل کی پرداخت کی تھی۔ وطن سے دور انہوں نے بہت خوبصورت شعر لکھے ہیں جن کی کسک وہ لوگ خوب سمجھ سکتے ہیں جو کوئے جاناں کی مسافت عشق میں ان کے ہم سفر تھے۔

لکھی تھی جس میں داستاں اونچی اڑان کی
رکھا تھا اس کتاب میں اِک پر لہو میں تر

اور

امن و اماں کا حال میں کیا اس سے پوچھتا
رستے میں مل گیا تھا کبوتر لہو میں تر

اشرف شاد نے اپنی شاعری میں ایک نسل کی شکستِ دل کی جو داستان لکھی ہے کیا وہ اس کہانی کا آخری باب ہوگا؟ غالبؔ نے کس کے لیے لکھا ہوگا۔

سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

اور اشرف شاد نے لکھا ہے۔

دیوار ٹوٹنے کا عجب سلسلہ چلا
سایوں کے سر پہ اب کوئی سایہ نہیں رہا
اب اُن کے حسن میں بھی کرشمے نہیں رہے
تالی تو بج رہی ہے تماشا نہیں رہا

اسی غزل کا کتنا خیال افروز شعر ہے کہ۔

شاید پڑوس میں کہیں بجلی گری ہے آج
دیکھو ہمارے گھر میں اندھیرا نہیں رہا

کیا دوسروں کے گھر جلا کر اپنے چراغ روشن کرنا اب ہمارا مقدر ہے؟ لیکن شکست و ریخت کی اس داستان کا ایک زریں باب تو خود اشرف شاد کی شاعری ہے جو ہر شعر میں گواہی دے رہی ہے کہ انسان کا احساس زندہ ہے، جھوٹ اور سچ کی تمیز باقی ہے اور لکھنے والے کے دل میں کسی معجزے سے وہ ساری قدریں سلامت ہیں جنہوں نے ہماری نسل کی جواں سالی کو اپنی خوشبو سے مہکا دیا تھا۔ یہ خوشبو دائمی ہے اور ہمارے سینوں میں محفوظ ہے۔ اونچی اڑان بھرنے والے کبوتر کا پر لہو میں تر سہی مگر اڑان کے عزم کی گواہی بھی ہے۔

آج کے پاکستان میں اشرف شاد کی شاعری صوبائیت کے ہاتھوں زخمی اور منقسم معاشرے میں اس دور کی یادگار ہے جب بقول اشرف شاد۔

لہجہ الگ الگ ہے قبیلہ تو ایک تھا
تشریح مختلف ہے، صحیفہ تو ایک تھا

کا نظریہ سفر کی سمت متعین کر سکتا تھا۔

شاؔد نے کیسا رونگٹے کھڑے کر دینے والا شعر کہا ہے۔

اِک شاؔد ہی نہیں جو وطن چھوڑ کر بِکا
کتنے گھروں کا مال دکانوں تک آ گیا

یہ ایک کڑوی سچائی ہے۔ مگر وطن کی مانگ سجانے کی خواہش ہر نئی نسل کے ساتھ از سرِ نو پیدا ہوگی۔ آج زندگی کے اُفق پر اندھیرا سہی مگر کل کو بہر حال طلوع ہونا ہے۔ اور ان کے لیے تو اشرف شاؔد نے لکھا ہے۔

تم آؤ آکے سارے اُجالے سمیٹ لو
میں نے دیے کو رکھا ہے شب بھر لہو میں تر

اس طرح شاد کی شاعری کا یہ مجموعہ وطن کی نئی نسل کے لیے ان کی محبت بھری سوغات ہے اور شعری مجموعوں میں روشن فکر اور خوبصورت فن کارانہ اظہار کا یہ اضافہ اک نوید۔

اے آمدنت باعث آبادیٔ

(نصاب کے اجراء پر۔۱۹۹۶ء)

سماجی اور سیاسی شعور کی شاعری

شفیع عقیل

آزادی کے بعد سے اب تک نصف صدی کے دوران پاکستان اور ہندوستان سے بے شمار افراد تلاشِ رزق، مہم جوئی اور قسمت آزمائی کی خاطر غیر ممالک میں گئے اور جن میں سے بیشتر مستقل طور پر انہی اجنبی ممالک میں بس گئے یا پھر طویل عرصہ کے لیے وہیں کے ہو کے رہ گئے۔ جو لوگ باہر گئے ان میں ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں جن میں عام محنت کشوں سے لے کر ہنر مند، ڈاکٹر، انجینئر، ماہرینِ تعلیم، سائنس دان اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہیں۔ انہی لوگوں میں بہت سے ایسے پڑھے لکھے لوگ بھی ہیں جن کا رشتہ علم وادب سے ہے اور ان میں شاعر اور ادیب حضرات کی خاصی بڑی تعداد ہے

یہ شاعر وادیب دنیا کے بہت سے ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہاں اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ ان کی تخلیقی سرگرمیوں سے جہاں ایک یہ فائدہ ہو رہا ہے کہ ان ممالک میں اردو زبان وادب کا چرچا روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، وہاں ہمارے ادب کو یہ فائدہ بھی ہوا ہے کہ اس میں ان حضرات کے نئے نئے تجربات ومشاہدات کی وجہ سے اظہار واسلوب کے نئے پہلو سامنے آ رہے ہیں۔ اپنی مٹی سے الگ اور دور رہ کر ایک لکھنے والا کیسے سوچتا ہے؟ زمین پر رہتے ہوئے بھی بے زمینی اور بے گھر ہونے کا احساس کن کن امکانات سے دوچار کرتا ہے؟ اور وطن کا ہجر و فراق سوچ کے کون کون سے در کھولتا ہے؟ یہ سارے پہلو جاننے اور سمجھنے کے لیے ان لوگوں کی ایسی تخلیقات کے مطالعہ سے سامنے آتے ہیں جو انہوں نے وطن سے دور رہ کر یا اس سے بچھڑ کر تحریر

کی ہیں۔

ایسے شاعروں کے بہت سے شعری مجموعے چھپ کر سامنے آچکے ہیں جن میں انسانی تجربے اور سوچ کے نئے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اسلوب اور اظہار کا نیا پن بھی ملتا ہے جو یقیناً اپنی زمین کی دوری کے سفر کی دین ہے۔ اس وقت جو شعری مجموعہ 'نصاب' پیش نظر ہے یہ بھی ایک ایسے شاعر کی تخلیقات پر مشتمل ہے جس نے اپنی سوچ کو آزاد رکھنے کے لیے خود جلاوطنی کے مصائب بھی برداشت کیے اور وطن سے دور رہ کر اپنی مٹی کے عشق کا دکھ سینے میں دبائے جگہ جگہ کا سفر کیا۔

اشرف شآد کا نام قارئین کے لیے اجنبی نہیں ہوگا۔ وہ برسوں سے وطن سے دور رہ رہے ہیں لیکن انہوں نے اپنی زمین سے رشتہ نہیں توڑا۔ اشرف شآد شاعر بھی ہیں، ادیب بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ صحافی ہیں۔ پاکستان میں کئی اخبارات و جرائد سے وابستہ رہے ہیں اور جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء دور میں وہ اپنے آپ پر جبر کر کے خود جلاوطنی اختیار کرتے ہوئے ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ امریکا میں رہے، کویت میں رہے، بحرین میں رہے اور اب آسٹریلیا میں قیام پذیر ہیں۔ وہ باہر کے ملکوں میں بھی مختلف اخبارات سے منسلک رہے اور اب بھی سڈنی میں ریڈیو سے متعلق ہیں۔

'نصاب' ان کا شعری مجموعہ ہے اور اس میں وہ تخلیقات بھی شامل ہیں جو انہوں نے ان غیر ممالک میں رہتے ہوئے لکھی ہیں۔ ان کی اس کتاب میں غزلیں، نظمیں، قطعات اور نثری نظمیں شامل ہیں۔ ان مختلف اصناف کی منظومات میں جو چیز مشترک ہے وہ اشرف شآد کا طرزِ اظہار ہے۔ انہوں نے اپنے تجربے، مشاہدے اور بے زمینی کے دکھ کو عام شاعروں کی طرح لفظوں یا لفظیات کا حصہ نہیں بنایا بلکہ اسے اپنے احساس میں سمو کر جذبے میں ڈھالا ہے اور پھر یہ جذبہ ان کے لہجے کی انفرادیت بن گیا ہے۔ دراصل اشرف شآد کا چونکہ صحافت سے براہ راست تعلق ہے اس لیے ان کے ہاں حالات و واقعات کا ادراک شعوری ہے جو ان کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے۔ وہ وطن سے دور تو رہے ہیں مگر ان کی یہ دوری محض جسمانی رہی ہے، ذہنی اور قلبی طور پر وہ اپنی مٹی سے کبھی دور نہیں رہے۔

انہوں نے غیر زمینوں پر رہ کر بھی اپنے وطن کا دکھ شدت سے محسوس کیا ہے۔ محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اس میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ برابر کے شریک رہے ہیں وہ کہتے ہیں:

اِک شاد ہی نہیں جو وطن چھوڑ کر بکا
کتنے گھروں کا مال دکانوں تک آ گیا

گردش زمین کی پاؤں کی زنجیر بن گئی
اور سر پہ آسمان کی چادر تنی رہی

راہوں میں مصلحت کے کئی پیچ تھے مگر
دار و رسن کا راستہ سیدھا لگا مجھے

اشرف شآد نے اپنی تین چار غزلوں کو چھوڑ کر ہر غزل میں گھسے پٹے قوافی استعمال کرنے سے اجتناب برتا ہے جس کی وجہ سے ان کے ہاں تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل اشرف شآد کی شاعری سماجی اور سیاسی شعور کی شاعری ہے اور ان کا احساس و جذبہ حالات کا براہ راست ردعمل ہے جس نے ایک نیا اور تازہ لہجہ عطا کیا کتاب میں مشور مصور بی ایم کے چند اسکیچ بھی شامل ہیں۔

(۱۹۹۶ء)

وزیراعظم، تاریخ کی گواہی

ہرچرن چاؤلہ (آں جہانی)

اشرف شاد کی کتاب (وزیراعظم) کوئی نشہ تھا کہ اترنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ میں پڑھتا گیا اور نشہ چڑھتا گیا۔ نواب ٹُن اور ذہین جلالی کی کردار نگاری بڑے غضب کی ہے۔ عوام کی مظلومیت اور سادہ دلی، امراء، وزراء اور رہنماؤں کی عیاشی بھری خودغرض زندگیوں کی تصویر کشی کس بے باکی اور بے خوفی سے کی ہے کہ جیسے ان کے کپڑے اتار کر انہیں سر بازار ننگا کردیا ہو۔ مافیا والوں کے لیے ہاتھ اور حکومتوں اور حاکموں پر ان کی مضبوط گرفت۔ کردار کش عورتوں کی سپلائی اور ان کے ہاتھوں کا کھلونا بنتے رہنا' کتنے ڈھکے چھپے چہرے' قصائیانہ چہروں پر چڑھے ریشم جیسے ملائم دکھاوٹی چہرے کہ جن کے نقاب آپ کے بے باک قلم نے نوچ ڈالے ہیں۔ ایک خوش رنگ نقلی اور کچے رنگوں کی تصویر تھی کہ جسے ان کے قلم سے نکلے لفظوں کی تند بوچھاڑ نے دھو دھا کر اپنی اصلی بدرنگ تصویر کا روپ دے دیا ہے۔ میں نے ان کے ناول کو سونے سے پہلے پڑھا ہے۔ اٹھنے کے بعد پڑھا ہے۔ دوپہر کو پڑھا ہے شام کو پڑھا ہے۔ جب جب موقعہ ملا ہے پڑھا ہے کہ اس میں Readability بہت ہے۔ مجھے ان کی Boldness (دیدہ دلیری) بہت پسند آئی ہے۔

(ناروے۔۲۰۰۰ء)

آئینہ در آئینہ

نقاش کاظمی

تلاشِ رزق میں سب ہجرتوں میں شامل ہے
زمیں زمین سے اور گھر سے گھر بدلنا بھی

اشرف شاد کا شمار بھی شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کی ایسی نسل میں ہوتا ہے جس کے پاؤں تلے سے اپنی مادرِ وطن کی زمین نکل چکی ہے۔ بے زمینی کی اس کیفیت میں وہ ہجرتِ پیہم کو گھنگھروؤں کی طرح اپنے پیروں میں باندھ کر دیگر بسملوں کی طرح سمندروں، دریاؤں، پہاڑوں، نخلستانوں، رنگوں اور روشنیوں کے مقتل میں آسودگیِ حیات کی خاطر رقص کناں ہوگیا۔ پاکستان میں ضیاء دور کے مارشل لاء کے جبر سے گلو خاصی کے لیے اس نے اپنے دیگر ہم خیال، روشن فکر اور باغیانہ رجحان رکھنے والے دوستوں کے ہمراہ جلاوطنی کے طوقِ آہنی پہن کر زمین اور گھر کے بدلے گھر والے فارمولے پر عمل پیرا ہونے کی راہ کو اپنا لیا۔ ملک بدر ہونے والے دوسرے بزرگ، ساتھی، ہم سخن تو اپنے آشیانۂ وطن کی جانب لوٹ آئے مگر اشرف شاد آگے اور آگے کی جانب رواں دواں ہوگیا۔ وہ امریکہ، بحرین، کویت کے زمان و مکان کو آزماتا ہوا، ایک دور دراز برِاعظم یعنی آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں مقیم ہوگیا۔ کون جانے آئندہ ماہ و نجوم کے اس شہرِ نگاراں سے وہ کسی اور جانب کا بھی قصد کرے۔

اشرف شاد نے وطنیت اور قومیت کے قدیم نظریۂ قدر (Values) کو اس صدی میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا اور ایک جست میں خود بھی سکندرِ اعظم کی طرح شہروں، ریگستانوں،

کوہستانوں اور سرسبز وادیوں کو فتح کرتا ہوا اپنے ایک چھوٹے اور مختصر سے 'خاندان' کی تخلیق میں مگن ہو گیا جس کے پس منظر میں 'تلاش رزق' بھی شامل رہا۔ لیکن حیاتِ وقت کے اس کوہِ گراں سے آبجو نکالنے والا اشرف شاؔد اپنی تہذیب، ثقافت، ادب اور شاعری کو اپنے دریدہ دامن، تار تار جیب و گریباں، سلگتے ہوئے لوح و قلم اور دکھے ہوئے سینے سے لگائے رہا۔ وہ بحرین میں ہو کہ کویت میں نیویارک میں ہو کہ سڈنی میں، شعر و سخن کی جوت کو آئینہ آئینہ روشن کیے رہا اور انتہائی کمالِ ہنر کا مظاہرہ کرتے ہوئے، نظموں اور غزلوں کی تخلیق کے ساتھ ساتھ انجمن سازی، محفل کاری اور نشستوں کا اہتمام بھی کرتا رہا۔

اشرف شاؔد کی شاعری کی ابتداء، یوں تو نوجوانی میں یعنی زمانہ طالب علم میں پاکستان میں ہو چکی تھی اور اپنے ہم عصروں میں اس کا یہ شعر:

مجھ کو بھی پڑھ کتاب ہوں مضمونِ خاص ہوں
مانا ترے نصاب میں شامل نہیں ہوں میں

مقبولیت حاصل کر چکا تھا، پھر اشرف نے کروٹ بدلی اور صحافت کے سنگلاخ میدان کو اپنے لیے منتخب کیا، شاعری کو طاق پر رکھ کر کانوں پر قلم اٹکائے اخبارات اور رسائل کے لیے حرف و لفظ چننے نکل کھڑا ہوا اور یہاں بھی اس نے ایک اہم مقام حاصل کیا یہاں تک کہ میدانِ صحافت میں بھی اس کے گھوڑے رفیقانِ کار سے ایک ایک کر کے آگے نکلنے لگے۔ پھر آگے بڑھنے کی اسی جستجو اور لگن نے اسے 'معیار' عطا کیا۔ آخر کار ادب و صحافت اس کی شناخت بنا ملک میں بھی بیرون ملک بھی۔

جہاں تک اشرف کی شاعری کا تعلق ہے اس کے مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ غالؔب کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے کلکتہ کا سفر کیا تو یہ سفر وسیلہ ظفر بنا اور غالب کی شاعری کو تجربات و مشاہدات کا عروج نصیب ہوا۔ لہٰذا اشرف کو وطن سے نکل کر جو تجربات حاصل ہوئے اس نے جدید حسیت اور نئے رجحانات کی روشنی کی ہجر و فراق، لطف و کرم، جبر و ستم، در و دیوار، چراغ و روشنی غرضیکہ قاتل و مقتول وغیر کی صورت میں استعاروں اور تشبیہات کا چھپا ہوا خزانہ اس شاعر کے آگے بکھیر دیا:

اب کے گلشن میں کہو کیسے مسائل نکلے
پھول ہی قتل ہوئے پھول ہی قاتل نکلے

اندھیری رات میں جلتے ہوئے جو کام آیا
اسی چراغ کا تاریخ میں بھی نام آیا

ہم کو ہے اعترافِ وفا
دار پر اب چڑھا دیجیے

ساقی لہو میں ترا مرا ساغر لہو میں تر
رقصاں ہیں آج زیست کے پیکر لہو میں تر

ہجرت و نقل مکانی کے موضوعات کو دیگر شعرائے بے وطن بے زمین نے بھی برتا ہے لیکن اشرف شآد نے محسوسات اور مشاہدات کی جو فضا بنائی ہے اس کی بنیاد ذاتی تجربات اور عملی معاملات پر رکھی ہے۔ لہٰذا اس کے اس طرزِ اظہار میں سچائی اور خلوص کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے جو دنیائے ادب میں شائقینِ سخن کو اپنے ڈرامائی انداز (Dramatic Attitude) سے مبہوت کر دیتا ہے:

گردش زمیں کی پاؤں کی زنجیر بن گئی
اور سر پہ آسمان کی چادر تنی رہی

جنگل میں بیاباں میں ویرانیٔ صحرا میں
ہر موڑ پہ رکھی ہے تصویر مرے گھر کی

اک شآد ہی نہیں جو وطن چھوڑ کر بکا
کتنے گھروں کا مال دکانوں تک آ گیا

اشرف شاد نے اپنے زیرِ اشاعت مجموعۂ کلام 'نصاب' کو مختلف سرزمینوں کے حوالے سے منقسم کیا ہے اور ادوار بنائے ہیں، اس طرح انہوں نے اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو قارئین سے اور قریب لانے کی کوشش کی ہے جو کہ ایک خصوصی التزام کا حامل ہے۔ لیکن جب شاعر کے ساتھ

ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کی جائے تو لگتا ہے شاعر کی رفتار بہت تیز ہے اور اسی تیز گامی میں جب وہ کویت میں ہوتے ہیں تو امریکہ یاد آتا ہے، امریکہ میں پاکستان کی یاد ستاتی ہے، سڈنی میں کویت کے یادگار لمحات کچوکے لگاتے ہیں، بحرین میں ہوں تو کسی اور جہاں کو یاد کرتے ہیں۔ گویا اضطراب کی یہ کیفیت ان کی غزلوں سے زیادہ نظموں میں اور نظموں سے زیادہ غزلوں میں محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشرف کی زبان اور لہجے کی کاٹ ان کی پہچان بنتی جا رہی ہے۔

ہر ایک حرف نگارش رٹا ہوا نکلے
کٹے زباں تو سخن بھی کٹا ہوا نکلے

اندھیرے طاق پہ سر رکھتے سوچتا ہوں میں
دیے کی رگ میں لہو بن کے رات جل جائے

یہ کھیل زندگی کے سفر کا عجیب ہے
پاؤں لہو میں تر، کبھی پتھر لہو میں تر

راہوں میں مصلحت کے کئی پیچ تھے مگر
دار و رسن کا راستہ سیدھا لگا مجھے

اس اظہارِ خیال میں طوالت مانع ہے، لیکن اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ غزل کے ان اشعار نے جو تاثر چھوڑا ہے اگر اس کو دوبالا کرنا ہو تو اشرف کی نظموں میں سے مندرجہ ذیل چند بے انتہا توجہ طلب ہیں۔ یہ مقبرہ ہے تیل کا، شی واز، کمیونی کیشن، خیال کی ایک رو، دار کی رہ گذر، فرار وغیرہ وغیرہ۔

اس اظہاریہ کی ابتدا میں نے اپنے شعر سے کی تھی کیونکہ اس شعر کا پرتو اشرف کی زندگی کے سرمائے میں محسوس کیا جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

(کراچی ۱۹۹۶ء)

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں

حسن عابدی

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب...... مجنوں لام الف لکھتا تھا۔ دیوارِ دبستان پر میں اور اشرف شاد ایک ہی اخباری ادارے میں ملازم تھے۔ وہ روزنامہ 'مشرق' میں اور میں ہفت روزہ 'اخبارِ خواتین' میں، لیکن صحافیوں کی انجمن میں ہم دونوں اپنے دیگر پُر جوش رفیقوں کے ساتھ ہمیشہ سرگرم رہے۔ اشرف شادؔ نوجوان تھے، ان کی سرفروشی کا جذبہ اپنے شباب پر تھا، انہوں نے ٹریڈ یونین کے بہت سے معرکوں میں اپنے کردار کے جوہر دکھائے۔ پھر وقت بدلا اور ماضی کی حکائتیں قصہ پارینہ ہوئیں۔ اشرف شادؔ آسٹریلیا چلے گئے۔ صحافت سے تعلق انہوں نے وہاں بھی برقرار رکھا۔ ایک ریسرچ پیپر لکھا۔ جس کے چند اوراق اُس وقت میری نظر سے گزرے جب چند سال پہلے وہ یہاں آئے تھے۔ اب کے ۱۹۹۶ء میں وہ کراچی آئے تو ایک اور انکشاف ان کی ذات کے بارے میں ہوا۔ کراچی پریس کلب کے مشاعرے میں انہوں نے اپنی غزل اتنے پُر سوز لحن میں پڑھی کہ مشاعرہ لوٹ لیا۔ میں نے بعد میں ان کی کچھ دوسری غزلیں پڑھیں۔ اشرف شادؔ اور وہ تمام شاعر جو شاعری میں اپنے دور کے تجربات کو بیان کرنے کی کاوش کرتے ہیں غالبؔ کے قبیلے کے لوگ ہیں۔ وہ اپنے عہد میں زندہ ہیں۔ اشرف شادؔ روایتی شاعر نہیں جو ہزار مرتبہ کے بیان کیے ہوئے مضامین کو قافیے اور ردیف کے پیوند لگا کر اپنا بنالیں۔ ایک صحافی ہونے کے ناتے ان کی نظریں حالاتِ حاضرہ پر رہتی ہیں پھر وہ ان سے متاثر ہوتے ہیں، اپنے عہد کی محرومیوں اور کلفتوں کو اپنے اندر محسوس کرتے ہیں اور ہنرمندی کے ساتھ انہیں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا شعر ان کے تجربوں کا عکس ہوتا ہے۔ مثلاً ان کی نظم 'یہ مقبرہ ہے تیل کا' خلیج کی جنگ کا پورا منظر نامہ ہے۔

آہنی ہیں بتیاں
بموں کی ہیں تجلیاں
بکھر رہی ہیں دھجیاں
شوخیاں غنیم کی
ہنس رہی ہیں برملا
کہانیاں رحیم کی، کریم کی
سسک رہی ہیں جا بجا
رو رہا ہے ہر دیا
یہ مقبرہ ہے تیل کا
دشمنوں کے کھیل کا

غزل میں سیاسی مضامین کو پرونا ایک مشکل فن ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بھی اشرف شاد کی کاوشیں قابلِ ستائش ہیں۔

ان سے ملا تو پھر میں کسی کا نہیں رہا
اور جب بچھڑ گیا تو خود اپنا نہیں رہا

ہر اک مکاں سے نام کی تختی اتر گئی
دل کی فصیل پر کوئی پہرا نہیں رہا

کچے گھروں سے پختہ مکانوں تک آ گیا
سیلاب اب کے اونچی چٹانوں تک آ گیا

اک تیر جس میں حوصلہ پرواز کا نہ تھا
ایسی ہوا چلی کہ کمانوں تک آ گیا

شاعری بہت ریاضت مانگتی ہے۔ اشرف شاد سے امید ہے کہ وہ شاعری کے مطالبے پر پورا اترنے کے لیے کاوش اور ریاضت میں کوئی کمی نہیں رکھیں گے اور وطن سے دور رہتے ہوئے اپنی شمع کی لو کو اتنا تیز کر دیں گے کہ اس کی روشنی ہم تک پہنچتی رہے گی۔ (نصاب کے اجرا پر۔ ۱۹۹۶ء)

اشرف شاؔد کے بارے میں

جی۔این۔قریشی

اشرف شاؔد کی طبیعت میں جو ٹھہراؤ اور اطمینان ہے وہ ہمیشہ اس کی شناخت رہا ہے۔ اشرف کے دوست اسے مرادآباد کی آب وہوا کا اثر قرار دیتے ہیں جہاں وہ ۱۹۴۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ بہت سال گزرنے کے بعد شاید اس آب وہوا کا اثر زائل ہو گیا ہے اور عمر کی نصف صدی طے کرتے ہی اس میں ایک عجیب سی بے قراری اور وہ عجلت آ گئی ہے جو اس کے مزاج کے خلاف رہی ہے۔ گزشتہ سال وہ 'نصاب' کی اشاعت کے لیے آیا تھا تو بغل میں 'بے وطن' کا کتابت شدہ مسودہ تھا اور شعری مجموعے کی جگہ اپنے پہلے ناول کے بارے میں زیادہ پُر جوش دکھائی دیتا تھا۔ 'بے وطن' شائع ہونے لگی تو وہ صرف 'وزیرِ اعظم' کے بارے میں باتیں کرتا سنائی دیا۔ اور ابھی 'وزیرِاعظم' مکمل نہیں ہوئی تھی کہ وہ دوستوں کو فون کر کے 'صدرِ محترم' اور 'اقتدار مافیا' کے پلاٹ سنا رہا تھا۔

اشرف کو حسب نسب، ذات، فرقے اور قبیلے کے امتیازات کبھی پسند نہیں آئے اور یہی وجہ تھی کہ مرزا اشرف علی بیگ شاؔد نے بہت پہلے اپنے نام کے وہ حصے استعمال کرنے چھوڑ دیے تھے جن سے ایسی کوئی شناخت ظاہر ہو سکتی تھی۔ لیکن اب کبھی کبھی آذر بائیجان کے مغل قبیلے 'جواں شیر' کا تذکرہ کرنے لگا ہے جو احمد شاہ ابدالی کے لشکر میں شامل ہو کر ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس کے آباؤاجداد تو ہندوستان پر حملہ کر کے وہیں کے ہو رہے تھے لیکن اشرف کے حملوں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ہنگری، امریکہ، بحرین اور کویت پر کئی ناکام و کامیاب حملوں کے بعد وہ گزشتہ آٹھ برسوں سے یاسمین، اپنی بیٹی ثمن اور بیٹوں ارسلان اور سلمان کے ساتھ آسٹریلیا میں پڑاؤ ڈالے

ہوئے ہے، لیکن اس کے دوستوں کو یقین ہے کہ اس کی بے چین روح کسی نئی لشکر کشی کے لیے تڑپ رہی ہوگی۔

یہ بھی شاید جنگ کرنے کی اس کی قبائلی روایت تھی کہ قلم کو وہ تلوار سمجھ کر استعمال کرنے لگا، نتیجے میں خود اپنے بدن پر کئی زخم کھائے، طویل بیروزگاریاں گزاریں اور دو بار جیل بھی کاٹی۔ اس نے صحافت کے سفر کا آغاز ۱۹۶۶ء میں 'حریت' سے کیا تھا۔ 'مشرق'، 'الفتح' اور 'اعلان' (امن) سے وابستہ رہنے کے بعد اس نے ہفت روزہ 'معیار' کے نام سے اپنا رسالہ نکالا جس کے بند ہونے اور اپنے خلاف متعدد مقدمات کی وجہ سے اس نے ۱۹۸۰ء میں جلاوطنی اختیار کی۔ قلم سے اس کا رشتہ پھر بھی نہیں ٹوٹا اور بحرین میں 'ویکلی گلف مرر' اور کویت میں 'ڈیلی عرب ٹائمز' کے لیے کام کرنے کے بعد اب سڈنی میں 'ایس بی ایس ریڈیو' کی اردو سروس کا سربراہ ہے۔ ملک ملک کے اس سفر میں اس نے نصابی علم کے حصول کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہے۔ اردو کالج سے بی اے کر کے قانون کی تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی۔ لیکن پھر بڈاپسٹ سے جرنلزم کا ڈپلومہ اور سڈنی سے سیاسیات میں ایم اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ناول نگاری کی تازہ مصروفیات کی وجہ سے ابھی تک نامکمل ہے۔

اشرف کی زندگی کی کہانی اس کی شریکِ زندگی یاسمین (ڈاکٹر کنیز فاطمہ شاد) کا تذکرہ کیے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ وہ بھی افسانے لکھا کرتی تھیں لیکن اب نیوروفزیالوجسٹ ہوکر سائنس دان کی حیثیت سے دنیا میں نام کما رہی ہیں۔ وہ اشرف کے تخلیقی سفر میں اس کا سب سے بڑا سہارا ہیں۔ اشرف کے بارے میں یہ بات بھی ہمیشہ کہی جاتی ہے کہ اس نے زندگی میں دوستوں کے سوا کچھ نہیں کمایا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی رہائش کہیں بھی ہو، رہتا وہ آج بھی پاکستان میں ہے۔

(۱۹۹۷ء)

میرا دوست میرا بھائی......

ارشاد راؤ

اشرف شادؔ ایک خوبصورت شخصیت کا نام ہے۔ پاکستان میں آزادیٔ صحافت، آمریت کے خلاف جدوجہد دنیا بھر کے مزدور ایک ہو جاؤ، ادب اور شاعری میں ان کی ذات اور کارنامے نمایاں نظر آتے رہیں گے، چاہے وہ دنیا کے دوسرے کنارے جا کر آباد ہو جائیں وہ ملک میں ہوں یا باہر ان کی شناخت یہی رہے گی۔

میرا اور اشرف کا ساتھ ایک ربع صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ اس کا آغاز مشرق کراچی سے ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورا ملک آمرانہ نظام کے خلاف سراپا احتجاج بنا ہوا تھا۔ عظیم عوامی ابھار کا دور۔ اشرف نے صحافتی اور سیاسی محاذوں پر بھرپور حصہ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے عمر میں کم لیکن ساتھیوں کی نظروں میں بلند مقام پر دکھائی دینے لگے۔ یوں لگا کہ ہم ایک بڑے انسان کے ساتھ ہیں جو اپنی منزل کی تلاش میں کسی لمبے سفر کی تیاریوں میں ہے۔ ایسا ہوا اور وہ فاصلے 'کم' کرتا ہوا، دنیا کے دوسرے کنارے آسٹریلیا چلا گیا۔ (کم اس لیے کہ آسٹریلیا میں ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ اپنے بہت قریب پایا)۔

اشرف کا پاکستان سے امریکہ، امریکہ سے بحرین، بحرین سے کویت اور پھر کویت سے آسٹریلیا کا سفر یقیناً دشوار اور کٹھن تھا۔ اس نے اس سفر سے پہلے اور بعد میں آسٹریلیا تک ہر مقام اور منزل پر اپنی شناخت برقرار رکھی۔ یہ مشکل کام تھا، دیس اور پردیس دونوں جگہوں پر۔ اس کے لیے اشرف نے جہد مسلسل سے کام لیا اور ہر مشکل آسان ہوتی گئی۔

اشرف کی ایک اور پہچان اس کی خوش پوشی اور خوش اخلاقی ہے۔ وہ ہر وقت مطمئن نظر آتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی شہزادہ ہو۔ اس نے کبھی اپنے دکھ کا اظہار نہیں کیا۔ یہ بات دوسری ہے کہ انہیں چپکے سے اپنے دل میں سموتا رہا۔ دل بیچارہ گوشت پوست کا ہوتا ہے، اس کی برداشت جواب دے گئی۔ اشرف نے دل کی بے وفائی بھی برداشت کرلی۔ اسی برداشت کا نام اشرف شاد سے 'نصاب' بن گیا ہوگا یا اس سفر کے کسی لمحے کا نام ہوگا جو میں رقم نہیں کرسکا۔ میرے لیے یہ ممکن بھی نہیں کہ تین دہائیوں کی کہانی ایک صفحے کی نذر کردوں۔

مجھے فخر ہے کہ اشرف ــــ میرا بھائی، میرا دوست ہے۔ میرے قبیلے سے ہے کہ:

ہر کہ کشتہ نہ شو از قبیلہ ما نیست

(۱۹۹۶ء)

بے وطن ۔ عرضِ ناشر

احمد شمسی

مجھ کو بھی پڑھ کتاب ہوں مضمونِ خاص ہوں
مانا ترے نصاب میں شامل نہیں ہوں میں

تیس برس پہلے اشرف نے یہ شعر کہہ کر جس کتاب کی شکل میں زندگی کا نصاب بننے کی کوشش کی تھی، 'بے وطن' اُسی کتاب کی پہلی قسط ہے۔ ان تیس برسوں میں انہوں نے جو کچھ ورق ورق جمع کیا وہ ان کی صحافیانہ کاوشوں اور شعری تخلیقات کی شکل میں ہم جستہ جستہ پڑھتے رہے ہیں۔ لیکن اب 'بے وطن' کی صورت میں وہ صحافی اور شاعر کی نقاب اتار کر ناول نگار کی شکل میں پہلی بار منظرِ عام پر آئے ہیں۔ انہوں نے اظہار کے اس ذریعے کو بھی بھرپور طریقے سے استعمال کیا ہے۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اظہار کے دوسرے دونوں ذرائع کی جو محدودات اور قیود ہیں وہ انہیں توڑ کر باہر نکلے ہیں۔ بے وطن وہ سیلِ آب ہے جس پر انہوں نے کوئی بند باندھنے یا جسے ہیئت کی مجبوریوں کا شکار ہو کر روکنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

اشرف شاد نے قلم کا سفر ۱۹۶۰ء کے عشرے میں شرع کیا تھا جس کے بعد ان کا نام کئی اخباروں اور رسالوں کی زینت رہا۔ یہ ان کی تحریر کی کاٹ تھی جس نے ۱۹۹۸۰ء میں انہیں اپنے ملک سے تعلق منقطع کر کے نقل مکانی کرنے پر مجبور کیا تھا۔ بہت برسوں بعد گزشتہ سال وہ پاکستان میں ایک بار پھر چھپے ہوئے لفظ کی صورت میں نمودار ہوئے تو اپنے شعری مجموعے 'نصاب' میں ملبوس تھے۔ پاکستان میں اشرف کی وجہ شہرت ان کی صحافیانہ نثر نگاری تھی اس لیے انہیں شاعر کے

روپ میں دیکھ کر دوستوں کو حیرت ہوئی تھی لیکن قریبی احباب کو علم تھا کہ 'نصاب' اصل میں 'بے وطن' کی تکمیل اور اس کے اشاعتی مرحلے تک پہنچنے کے درمیان ایک وقفہ تھا۔

'بے وطن' ابتدا میں ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ناول تھی لیکن پچھلے سال پاکستان میں اپنے قیام کا بیشتر وقت اشرف نے اس کی کاٹ چھانٹ اور قطع و برید میں گزارا جس کے بعد کتاب کے ہر لفظ کو ایک بار پھر کمپیوٹر کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ درمیان میں طویل فاصلے حائل تھے اس لیے 'بے وطن' کے مسودے نے کئی بار آسٹریلیا کا فضائی سفر بھی کیا۔ 'بے وطن' کی اشاعتی لاگت میں، جو پہلے ہی کم نہیں ہے، کوریئر، فون کالوں اور فیکس کے گرانبار اخراجات بھی شامل ہیں پھر بھی ہم نے ناول کی قیمت اتنی ہی ضخامت رکھنے والی کتابوں کے مقابلے میں کم رکھی ہے۔

کتاب کی ضخامت زیادہ ضرور ہے لیکن شروع کے چند باب گزرنے کے بعد آپ کو ناول طویل نہیں لگے گی۔ اشرف نے کہانی کے بطن سے کہانیاں نکالی ہیں۔ یہ کہانیاں پڑھنے والے کو کبھی اداس اور کبھی حیران کر دیں گی۔ اور کبھی کبھی دل میں سرور انگیز مٹھاس بھر دیں گی۔ آخری بابوں میں جا کر کہانی بہت تیز ہوگئی ہے اور آخر تک اپنا تجسس برقرار رکھتی ہے۔ ناول کے کرداروں کو بھی ان سے وابستہ کہانیوں کے ذریعے ابھارا گیا ہے۔ یہ کردار کسی انجانی دنیا میں تنہا زندگی گزارنے والے افراد نہیں ہیں بلکہ انہیں اسی دنیا میں رہنے والے دوسرے کرداروں کے ساتھ موازنے کے عمل سے اجاگر کر کے زندہ کیا گیا ہے۔

(۱۹۹۷ء)

فطری رومانیت، غنائیت اور ترنم

شمیم زیدی

اشرف شاؔد بنیادی طور پر صحافی ہیں۔ جب انہوں نے صحافت کا سفر شروع کیا اور 'مشرق' میں ایک نوجوان رپورٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے تو لوگوں نے انہیں ہونہار صحافی کہا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ ہونہار صحافی سے بے باک صحافی بنتے گئے۔ اب صحافی یا اس کا قلم بے باک ہو جائے تو ہمارے ملک میں اسے بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اشرف شاؔد نے غلطی سے نوعمری میں ہی اپنے لیے مشکل راستے کا انتخاب کیا اور نتیجے میں انہیں بھی وہی سب کچھ جھیلنا پڑا جو سچ بولنے والوں کو جھیلنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک طویل تکلیف دہ اور صبر آزما وقت گزارنے کے بعد انہیں خود اختیاری جلاوطنی پر مجبور ہونا پڑا۔

ملکوں ملکوں کی خاک چھاننے اور در بدر ہونے کے بعد وہ بحرین اور پھر کویت پہنچے۔ لیکن صحافی کہیں بھی رہے وہ صحافی ہی رہتا ہے۔ اشرف شاد بھی کسی نہ کسی طور صحافت سے وابستہ رہے اور جو کچھ دل پہ گزرتی رہی صحافیانہ لہجے میں رقم کرتے رہے۔ کویت میں قیام کے دوران وہ 'عرب ٹائمز' کے صفحات میں عالمی سیاست اور بالخصوص پاکستان کی سیاست پر اپنے انداز میں بلاخوف و خطر تبصرہ کرتے رہے۔ یہ سلسلہ شاید اسی طرح چلتا رہتا لیکن اپنے ملک کے حالات اب اس نوبت کو پہنچ چکے تھے کہ حساس ذہن رکھنے والا کوئی بھی شخص خون کے آنسو روئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

اشرف شاؔد کے لیے بھی اب اپنے ملک کے حالات اور زندگی کے تجربات کو محض صحافت کی سیدھی سادھی زبان میں بیان کر دینا ممکن نہیں رہا۔ اس کے لیے انہیں اب ایک بڑے کینوس اور

دل کی زبان کی ضرورت تھی۔ وہ دل کے بہلانے کے لیے غالبًا پہلے بھی شعر کہتے ہوں گے لیکن اب شعر کہنا ان کی ضرورت تھی اس لیے کہ جن جذبات کا وہ اظہار کرنا چاہتے تھے، رپورٹر کی زبان وہ سب کچھ ادا کرنے سے قاصر تھی۔ پھر شعر کہنے کے لیے انہیں کسی محنت طلب شعوری کوشش کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ انہوں نے شعر اس لیے نہیں کہے کہ انہیں مشاعرے میں سنانے کے لیے نئی غزل کی ضرورت تھی بلکہ اس لیے کہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا وہ شعر ہی کی صورت میں کہا جا سکتا تھا۔

کویت کے قیام کے دوران، ملک کے اندوہناک اور ہیجان خیز سیاسی حالات اور کویت کے ادبی اور شاعرانہ ماحول نے اشرف شاد کی شاعری اور ہمعصر شعراء میں اشرف شآد کہاں جگہ پائیں گے، مجھ جیسے کم علم کے لیے یہ اندازہ لگانا یا کوئی دعویٰ کرنا مشکل بات ہے کہ اس کا فیصلہ ان کے اشعار کی سچائی اور وقت کریں گے۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اگر خیال کی گہرائی، بیان کی سچائی اور زبان کی سادگی کسی بھی شعر کی سب سے بڑی خوبیاں ہیں تو اشرف شاد کے بیشتر اشعار ان تینوں خوبیوں سے مالا مال ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل بات نہایت سادہ سی زبان میں کہہ گزرتے ہیں اور کہتے بھی ہیں اپنے منفرد لہجے میں، اور یہ ان کی شاعری کی ایک بڑی خوبی ہے کہ وہ اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار اپنے انفرادی انداز میں کرتے ہیں کسی اور کے لہجے یا آواز میں نہیں۔ اور اس کے باوجود کہ ان کی بیشتر شاعری جدید جذباتیت اور حسیت کا نتیجہ ہے انہوں نے کبھی اپنے لہجے کو غیر ضروری طور پر تلخ نہیں ہونے دیا بلکہ اس میں اپنی فطری رومانیت، غنائیت اور ترنم کو برقرار رکھا۔

ایک مرتبہ فیض احمد فیض نے کسی نوجوان شاعر کے بارے میں کہا تھا کہ فنکار کی عظمت اور بزرگی اس کے سن و سال سے نہیں بلکہ اس کے فکر و فن سے ہے۔ اشرف شآد کی شاعری کو دیکھ کر فیض صاحب کی اس بات کی سچائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۱۹۹۶ء)

پہلی لکیر: اشرف شاد کا نیا ادبی تحفہ

محمد علی کینبرا

اشرف شادؔ کا نام ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ جب بھی اشرف سے ملتا ہوں تو مجھے کراچی کا وہ پُر آشوب دور یاد آ جاتا ہے جب آتش جواں تھا۔ یہ پرانی آتش میں خود ہوں کیونکہ اشرف جیسے لوگوں پر خزاں کبھی نہیں آتی۔ مجھے اس وقت کی جامعہ کراچی کی ادبی سرگرمیاں یاد ہیں جس میں اشرف بھی شامل ہوا کرتے تھے اور مجھے بھی کچھ نہ کچھ انہیں 'چکھنے' کا موقع مل جاتا تھا۔ دوستوں کے مطابق اس وقت شاعروں میں اشرف ایک کالی شیروانی پہن کر شرکت کرتے تھے اور اس زمانے ہی میں چکنے چکنے پات ہونہار بروا کی خبر دے رہے تھے۔

اشرف کے اندر ایک شاعر ان کے اوائل عمری ہی سے نمو پا رہا تھا۔ غالباً ۱۹۶۸ء کا ان کا ایک شعر۔

مجھ کو بھی پڑھ کتاب ہوں مضمونِ خاص ہوں
مانا ترے نصاب میں شامل نہیں ہوں میں

بہت مشہور ہوا اور اس زمانے کے یونیورسٹی (جامعہ) کے عشاق کے لیے ایک تحفۂ خاص ثابت ہوا۔ اشرف کا سفر پھر اسی شعر پر ہی ختم نہ ہوا۔ اردو کالج جو اب جامعہ ہے وہاں شروع ہونے والا سفر انہیں صحافت کے میدانوں میں لے گیا اور پھر ایک شاعر، ایک نازک مزاج شخص جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا۔ اشرف کے ہاں شاعری میں دونوں رجحانات یعنی سیاست اور رومان تو ملتے ہی ہیں لیکن پھر جب اشرف نثر کی طرف آئے تو سیاست کو ڈرامہ بنا کر اس میں بھی

ایک عجب رومانیت بھر دی۔ 'صدرِ محترم'، 'وزیر اعظم' اسی سیاسی ڈرامے کی کہانیاں ہیں۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ اشرف کی لکھنے کی بھوک یہاں آ کر تسکین حاصل کر لے گی لیکن وہ اشرف ہی کیا جو ایک جگہ ٹک کر بیٹھ جائیں۔ اور بیٹھ بھی کیسے سکتے ہیں جب ارد گرد معاشرتی ناانصافیاں، ناہمواریاں اور غربت پھیلی ہو تو اشرف جیسا آدمی پھر خاموش کیسے رہ سکتا ہے لہٰذا اپنی بات افسانوں اور مختصر کہانیوں کی صورت میں کہنا شروع کی اور کم وقت میں دل میں اتر جانے والا ادب تخلیق کیا۔ 'بے وطن'، 'صدرِ محترم'، 'وزیر اعظم'، 'آمرے قریب آ' کے بعد ادب میں پہلی لکیر کھینچ دی جسے لے کر وہ سڈنی کی پُر آشوب ماحول میں آئے ہیں۔ 'پہلی لکیر' اشرف کا وہ تحفہ ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اشرف ادب کے ہر مسلّمہ Genre میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

میں نے 'پہلی لکیر' کے تین افسانے پڑھے۔ جن میں مجھے کئی نمایاں خوبیاں نظر آئیں۔ ایک تو اردو کی چاشنی اور اردو کے الفاظ اور محاوروں کا خوب صورت اور معنی خیز استعمال۔ پھر حالاتِ حاضرہ کا ادراک کہ ہم ایک بحران ختم کرتے ہیں تو دوسرا شروع ہوتا ہے اور سیاستِ دوراں پر اشرف کی گہری نظر۔ کتاب میں 'پہلی لکیر' ایک انوکھا افسانہ ہے جسے پڑھ کر کرتار سنگھ یاد آتا ہے۔ 'پہلی لکیر' میں بھی ایک چونکانے والا نئی طرح کا احتجاج ہے۔

اشرف میں ایک خامی یہ ہے کہ وہ کہیں ٹک کر نہیں بیٹھتے میری دعا ہے کہ وہ اب افسانوں کی اس دنیا میں مقیم رہیں تو وہ ہمیں منٹو کی یاد دلاتے رہیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یقین ہے اشرف ادب میں اشرف ہی رہیں گے اور آنے والے دنوں میں ہم انہیں اور بھی شاد دیکھیں گے۔

اشرف کے ادبی اور زندگی دونوں سفروں میں اگر یاسمین شاد کا نام نہ لیا جائے تو بڑی زیادتی ہوگی۔ یاسمین ان کی شریکِ سفر بھی ہیں اور ادبی زندگی میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں۔ خود سائنس دان ہیں لیکن ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب کے بقول ایک سائنس دان کو اگر ادب سے بھی لگاؤ ہو تو بات دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ یاسمین اشرف کے ادبی سفر میں وہ بے نام سپاہی ہیں جو اشرف کے مختلف مزاجوں کا خیال رکھتی رہی ہیں اگر وہ یہ نہ کرتیں تو شاید آج اشرف، اشرف نہ ہوتے۔

(سڈنی میں 'پہلی لکیر' کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا ۲۰۱۲ء)

ذکر اشرف شآد کا اور بیاں اپنا

ڈاکٹر یاسمین شآد

آج اُس شخص کے بارے میں لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ جس کو میں نے ہوش سنبھالتے ہی جانا ہے۔ یا شاید جب سے اسے جانا ہے تب سے ہوش سنبھالا ہے۔ یہ شعور بے شعور اور لاشعور کے سلسلے حدِ نگاہ بلکہ شاید اس سے بھی آگے تک پھیلے ہوئے ہیں۔

ان سے دل کے پاس ملاقات ہوگئی
میں خود تو ڈھونڈنے کے لیے دربدر گیا

کئی دہائیوں پر پھیلے ہوئے وقت کے یہ پھیلتے سکڑتے مناظر کراچی کی ادبی نشستوں، ہوٹلوں، قہوہ خانوں، کراچی پریس کلب، ریڈیو پاکستان اور کئی اخبارات کے دفاتر کے بعد لاہور کی جیل پھر ہنگری، ترکی، روس، رومانیہ، جاپان کی رومان پرور فضاؤں سے نکل کر کراچی اور حیدرآباد کی جیلوں سے ہوتے ہوئے نیویارک، بحرین، کویت اور سڈنی تک پہنچے ہوئے ہیں...... دور دور تک پھیلے ہوئے دھندلے اور واضح مناظر میں جو چہرہ جو شخص جو منظر جو جذبہ مشترک ہے...... وہ ہے اشرف شآد۔

جی ہاں! اشرف شآد میرے لیے ایک شاعر، ایک صحافی، ایک شوہر، ایک دوست، ایک انسان سے بڑھ کر ایک جذبہ ہے ایک سلسلہ ہے توانائیوں کا...... کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ!!

تو ہوا یوں کہ ایک روز اچانک یوں ہی اسٹوڈنٹس رائٹرز گلڈ کے دفتر سے تحریر کا ایک پروانہ محترمہ یاسمین حسین ناز بعد میں تسلیم و نیاز کے شروع ہوا اور پھر ایسے بہت سے پروانے 'الفتح' اور

'مشرق' کے دفاتر سے پرواز کرتے رہے، جیل کی سنگلاخ دیواروں سے ٹکراتے رہے، نیویارک ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی اونچی مچانوں پر پھڑ پھڑاتے رہے۔ یہ مکتوب ایک طویل سفر کی داستان تھے۔ وہ سفر جو کچھ اس طرح رہا کہ 'آج یعنی اتوار ۲۸ نومبر ۱۹۷۱ء کو میری نیوز ایڈیٹری کا پہلا روز تھا۔ گیارہ بجے دن سے دفتری ڈیوٹی پر تھا لیکن صبح ساڑھے گیارہ بجے سے ہی ریڈیو پاکستان کراچی کی چہار دیواری میں داخلے کی جستجو کرتا رہا اس سے متصل فٹ پاتھ پر دھوپ سے لطف اٹھاتا رہا، ہوٹلوں کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے بوٹ پالش والوں سے اپنے جوتے چمکواتا بلکہ انتظار کی گرد صاف کرواتا رہا۔

'پیر ۱۱ر جنوری ۱۹۷۲ء میری روح میرے فرشتے میرے خدا...... ان سب چیزوں پر ایمان لے آیا ہوں اس یقین کے ساتھ کہ اب یہ ایمان متزلزل نہ ہوگا۔' 'اور پھر لاہور ۵ جون ۱۹۷۴ء۔ گرفتاری اور جیل کے الفاظ خاصے خوفناک ہیں اس لیے باعثِ پریشانی ہو سکتے ہیں لیکن میرے ساتھ معاملہ بالکل برعکس ہوا ہے۔'...... اس کے بعد 'بڈاپسٹ ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء تم نے شروعات کی ہے کہ جگر تھام کے بیٹھو۔ لیکن جب جگر لہولہو ہو تو پھر اس مائع کو تھامنے کے لیے ہاتھوں کا کاسہ تنگ ہو جاتا ہے'...... اور پھر '۲ر اپریل کی شام کو ہم دو گھنٹے کی فلائٹ کے بعد رومانیہ کی سرزمین پر پہنچے۔ رومانیہ میں آرجش کاؤنتی کا یہ پٹشتی نامی شہر ہے جہاں'...... اس کے بعد 'ٹوکیو ۱۳ر جنوری ۱۹۷۹ء۔ ٹوکیو میں اس وقت برف باری ہو رہی ہے، ہر طرف سفید چادر بچھی ہے اور اپنے دل سے صرف سرد آہیں نکل رہی ہیں۔ بیٹی بہت یاد آتی ہے اور تم...... ' اور پھر 'نیویارک ۱۲ جنوری ۸۱ء۔ مجھے احساس ہے کہ میں تمہیں کتنی مشکل صورتِ حال میں اور کتنی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے چھوڑ آیا ہوں۔ تم پر یہ میرا اعتماد ہمیشہ رہا ہے کہ تم کسی کام کو مجھ سے زیادہ مستقل مزاجی اور حوصلہ و ہمت سے کر سکتی ہو۔' اس کے بعد 'نیویارک ۱۵ر ستمبر ۸۱ء تمہاری صحت تمہاری ذات کا نہیں ہم 'سب' کا اجتماعی مسئلہ ہے۔ اس سب میں، میں تم اور وہ دونوں بچے ہیں جو ہم سے ہیں اور ہم جن سے ہیں۔ تمہاری قوت سے ہی تو میں توانائی حاصل کرتا ہوں۔'

تو جب جذبوں کے اس کاغذی سفر میں جن میں دوریوں نزدیکیوں کی دھوپ چھاؤں رہی کچھ ٹھہراؤ آیا تو معلوم ہوا کہ اشرف شادؔ نیویارک سے ہوتے ہوئے بحرین پہنچ گئے۔ اس چھوٹے سے خوبصورت جزیرے میں اشرف کی روح میں دہکتے ہوئے ان کے خوبصورت افکار کے موتی ایک ایک کر کے دنیا کے سامنے جگمگانے لگے اور یوں بحرین، پاکستان، کویت، سڈنی کے اہلِ

ذوق شاعری کے اس نئے لہجے پر چونک پڑے یہاں تک کہ ان کے پرانے رفیقِ کار بھی بے اختیار کہہ اٹھے کہ نیویارک سے سڈنی کے اس پندرہ سالہ طویل سفر نے اشرف کی شاعری کو ایک نئی جلا بخشی ہے اور میں مداحوں کے اس عالمی ہجوم میں کہیں دور ایک کونے میں کھڑی سوچ رہی ہوں کہ یہ آواز یہ لہجہ یہ افکار نئے تو نہیں ہمیشہ والے وہی اشرف جو کبھی سرگوشیوں، کبھی خطوں اور کبھی حالتِ جنون میں یہی سب کچھ جانے کب سے کہہ رہے ہیں۔

آخر میں یہ بات کہنا بے حد ضروری ہے کہ میں اس شخص اشرف شاؔد کے بارے میں اس کا ایک فیصد بھی نہیں کہہ سکی جو میں جانتی ہوں۔ گو کہ اس شاعر کے اندر جھانکنے کا فخر مجھے حاصل ہے لیکن آپ اسے کوتاہ قلمی کہیں یا بیان کی کمزوری کہ میں اشرف شاؔد کے بارے میں وہ کچھ نہیں لکھ سکتی جو میں لکھنا چاہتی ہوں جو بیان کرنا چاہتی ہوں۔

(۱۹۹۶ء)

عصری شعور، ترقی پسندانہ سوچ

ڈاکٹر کوثر جمال

اشرف شاد کا عصری شعور ان کی شاعری سے واضح طور پر جھانکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس عصری شعور کو ان کے زمانۂ شباب کی ترقی پسندانہ سوچ، سرگرم صحافتی زندگی، غریب الوطنی اور ممالکِ غیر میں زندگی بسر کرنے کے بھرپور تجربات نے مل جل کر تشکیل دیا ہے۔ یہ عصری شعور ایک ایسے حساس انسان کا ہے جو بنیادی طور پر انسان دوست ہے۔ جبر و زیادتی کی تمام صورتوں کو رد کرتا ہے اور اپنی تخلیقی سوچ کو غزل و نظم سمیت ادبی اظہار کے مختلف پیرایوں میں بیان کرتا ہے۔

اشرف شاؔد کے مجموعۂ کلام میں اکثریتی حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان غزلوں میں کہیں کہیں روایتی مضامین غزل کے روایتی انداز میں بیان کیے گئے ہیں، جیسے ؎

اور آنکھوں کو کیا دیجیے
خونِ دل ہے بہا دیجیے

لیکن ان کی غزلوں کا عاشق مجموعی طور پر روایتی نہیں ہے ؎

میری اذیتوں کا سفر ختم ہوگیا
اب اس کے زخم دیکھنا اچھا لگا مجھے

اس مجموعۂ کلام کا بہترین حصہ ان غزلوں پر مشتمل ہے جن میں عہدِ حاضر کے حساس اور باضمیر انسان کی داخلی و خارجی واردات کو اس کے عصری پس منظر سمیت، جبر و ناانصافی کی داستان، سیاسی و سماجی ستم ظریفیاں، غریب الوطنی اور شب کے مصاحبین سے لڑنے کے المیوں نے بیسیوں

خوبصورت اشعار کا روپ دھارا ہے۔

یہ کیا ستم ہے کہ میں جس زمیں پہ پاؤں رکھوں
اُسی زمین کا محور ہٹا ہوا نکلے

ہر ایک حرف نگارش رٹا ہوا نکلے
کٹے زباں تو سخن بھی کٹا ہوا نکلے

لکھی تھی جس میں داستاں اونچی اڑان کی
رکھا تھا اس کتاب میں اِک پر لہو میں تر

شب کے مصاحبین سے لڑتے اگر نہ شآد
پردیس میں نہ رہتے نہ مرتے جوان سے

تنہا جو سرِ دار لٹکتا ہی کوئی شخص
پیچھے کبھی اس شخص کے اِک غول رہا تھا

ان اشعار کی معنویت اور عصری پس منظر ہمارا جانا پہچانا ہے اور 'گویا یہ بھی میرے دل میں ہے' کی سی تاثیر رکھتا ہے۔ خود غزل کے بارے میں شاعر نے ایک جگہ اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ہے۔

جمالِ یار سے دار و رسن تک آ پہنچی
اب اس سے آگے کہاں تک بھلا غزل جائے

اشرف شآد سے اتفاق کرتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خود ان کی غزلوں میں بھی آگے جانے کے بجائے مختلف سمتوں میں بہاؤ کی قوت موجود ہے۔

شاعر نے غزل کے ساتھ ساتھ اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار، اس مجموعے میں شامل چند عمدہ نثری نظموں جیسے 'کمیونی کیشن'، 'اکتاہٹ'، 'دار کی رہ گزر' اور 'ایک نئی تخریب' میں بھی کیا ہے۔ ان

نظموں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک عمدہ غزل گو شاعر اپنے خیال کی پیچیدگی، وسعت یا تہہ داری کی بدولت ہی نثری نظم کو ہاتھ لگاتا ہے۔ خود فرانس میں بودلیئر کی نثری نظم اس حقیقت کی دلیل ہے کہ ایک معاشرے کا مجموعی شعور، جدیدیت کے مشکل دور میں داخل ہو کر اظہار کے لیے اور آزاد پیرایوں کو تلاش کرتا ہے۔

مجموعی طور پر اشرف شاد کی فکر اور طرزِ اظہار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا مجموعۂ کلام وسیع پیمانے پر اردو قارئین کی توجہ حاصل کرے گا اور جدید اردو شاعری میں قابلِ ذکر اضافہ قرار دیا جائے گا۔

(۱۹۹۶ء)

غزل کا حیران کن موڑ!

عارف رانا

اشرف شاؔد شاعری اس لیے نہیں کرتے کہ وہ شاعر کہلائیں۔ ان کی تمام شاعری ذات کا اظہار ہے۔ شاؔد کے اشعار مشقِ سخن کے نتیجے میں وجود میں نہیں آتے بلکہ یہ مضامین کے وارد ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ یا پھر اپنے احساسات وجذبات کی شدت کو اشعار میں ڈھال دیتے ہیں:

برسات ایسی آئی کہ ساغر چھلک پڑے
اشکوں سے میرے خون کی سرخی نکل گئی

اشرف شاؔد کی شخصیت کی سادگی ان کی شاعری میں بھی جھلکتی ہے۔ خیال کی بلندی زبان کی سادگی، پر معنی مضامین، نغمگی اور شعریت سے بھرپور کلام ان کو عہدِ حاضر کے صفِ اوّل کے شعراء میں کھڑا کر دیتا ہے:

لکھی تھی جس میں داستاں اونچی اُڑان کی
رکھا تھا اُس کتاب میں اِک پر لہو میں تر

یوں تو اشرف شاؔد تمام بڑے شاعروں کی طرح بین الاقوامی معاشرے کا فرد نظر آتا ہے، مگر دیارِ غیر میں رہتے ہوئے اپنے وطن، اپنی مٹی، اپنے دیس کی ہواؤں، اپنے موسموں، اپنے دریاؤں، کھیتوں کھلیانوں اور اپنے وطن کے پہاڑوں میں بہتی ہوئی آبشاروں کی یاد میں ہر وقت دل گرفتہ رہتا ہے۔ اپنے وطن کے سیاسی اور سماجی رویوں سے شاکی یہ شاعر دل پر غموں کے بھاری پتھر محسوس کرتا ہے:

یوں تو نازک لگتی ہے اشکوں کی بے جان لڑی
غم کے بھاری پتھر کو لیکن دل سے سرکا دے

ہمراہ لے گئے ہیں محافظ سمیٹ کر
بھوکے کسی کسان کا جتنا اناج تھا

انتہائی نازک مزاج اور دھیمے لہجے میں دلفریب گفتگو کرنے والا اشرف شآد اپنی شاعری میں عزم و استقلال کی ایسی چٹان دکھائی دیتا ہے جسے عہدِ خراب کی سختیاں جھیلنے کی عادت ہوگئی ہو۔ یہ شاعر اپنے عہد کے فراعین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر معاملہ کرنے کو مقصد حیات جانتا ہے:

ظالموں سے تم سوالِ رہبری
پوچھنا تو سر اٹھا کر پوچھنا

جدید شعراء نے غزل کو روایتی دور سے نکال کر جہاں پہنچایا ہے اشرف شآد نئے تخیل اور جدید مضامین کے اعتبار سے مزید آگے بڑھاتا ہے۔ غزل میں جہاں وہ حسن و عشق، ہجر و وصال، انتظار، بے ثباتی اور بے وفائی جیسے موضوعات کو اچھوتے انداز میں پیش کرتا ہے وہ مظلوم انسانیت کے بہتے ہوئے خون کو غزل جیسی نازک صنف کا موضوع بنا کر غزل کو حیران کن موڑ پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے:

تم تو بس اپنے زخمِ جگر پر ہو نوحہ گر
میرے تو شہر کا ہے ہر اک گھر لہو میں تر

اشرف شآد نے غزل کے ساتھ ساتھ جدید نظمیں بھی کہی ہیں۔ جن میں موضوعات کی تازگی ان کی غزلوں کا ہی رنگ لیے ہوئے ہے۔ مراد یہ ہے کہ نظموں میں غیر انسانی سماجی رویے، معاشرتی ناہمواریاں اور ان سے پیدا ہونے والی الجھنوں کو موضوع بنایا ہے۔

اشرف شآد جہاں زندگی کے لطیف پہلوؤں کو موضوعِ سخن بناتا ہے، وہاں وہ پورے انسانی معاشرے کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف سینہ سپر بھی دکھائی دیتا ہے۔ فنی اعتبار سے اشرف شاد کی شاعری ایک مکمل شاعری ہے۔ جس میں کسی اعتبار سے جھول نظر نہیں آتا:

مجھے تو شآد بس اتنی سی اک شکایت ہے
کہ چاند میرے لیے کیوں گھٹا ہوا نکلے

اشرف شاد کی کھینچی ہوئی پیلی لکیر

ڈاکٹر نگہت نسیم (سڈنی)

ہمارے قلم کاروں کی ایک بہت بڑی تعداد روایتی ملاّ کی طرح عمل سے عاری ہے۔ الفاظ کی جگالی ہوتی ہے یا پھر فقروں کو لفظوں کی شان و شوکت سے خوبصورت بنایا جاتا ہے عمل اور تجربے کی کسوٹی سے نہیں۔ پبلک ریلیشنگ یا ادبی تنظیموں کے منتظمین سے راہ و رسم ہی اب لکھاری کا معیار و مرتبہ قائم کرتی ہے۔ دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح شکر ہے کہ ادب کے شعبے میں بھی مجھ سمیت کچھ لوگوں نے ان معیارات سے بغاوت کی ہے اور بس یوں سمجھئے کہ ہم جیسے لوگوں کو پرانی یادگار عمارتوں کی طرح اخلاقی اقدار کے حوالے سے محفوظ کر لینا چاہیے۔

اشرف شاد کی ۱۶۲ صفحوں پر مشتمل 'پیلی لکیر' کے مطالعے کے بعد سب سے پہلے تو میں انہیں ان ہی کے اس سوال کا جواب دے دوں کہ 'مجھے افسانے لکھنے چاہیے تھے یا نہیں' تو میرا جواب ہے کہ جی ہاں انہیں افسانے ہی لکھنے چاہئیں تھے کہ انہیں ناول میں مختصر افسانے اور افسانوں میں افسانچے لکھنے کا ہنر آتا ہے۔

میرا ماننا ہے کہ افسانہ اظہار کی تکمیل کا حسن رکھتا ہے اور کوئی بھی تخلیق کار اس وقت تک کوئی زندہ تخلیق نہیں لکھ سکتا جب تک کہ اس میں سات عناصر موجود نہ ہوں۔ اپنی بات کی دلیل کے لیے اشرف شاد کی تخلیق پیلی لکیر میں ان سات عناصر کا سرسری سا جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ تخلیق کار کو حقیقت کو افسانوی شکل اور فسانے کو حقیقت کی طرح لکھنا آتا ہو۔ 'پیلی لکیر' کی کہانی 'ایک کہانی غربت کی' میں وہ لکھتے ہیں 'غربت پر لکھی جانے والی کہانیاں طبقاتی شعور

اجاگر کرتی ہیں اور طبقاتی شعور اجاگر کرنے والوں نے وہ چادر بھی اتار لی جس سے غربت اپنی پردہ پوشی کرتی تھی' پھر اسی افسانے میں کئی دلگداز حقیقتیں علی اکبر، راشد اور بی بی جان کی صورت میں مل جاتی ہیں۔

۲۔ تخلیق کار کی اطراف کی تبدیلیوں پر گہری نظر ہو۔ بالکل ایسے: جیسے افسانے 'بدلتے زمانے' میں کاظمی صاحب کو تبدیلی کا ادراک ہو جاتا ہے کہ دنیا بھر کی فحاشی بارہ سال کے بچے کی انگلیوں پر ناچتی ہے یعنی کمپیوٹر پر اور ان کا رسالہ تو چالیس سے پچاس برس کی عمر کے لوگوں کے لیے تھا۔

۳۔ تخلیق کار اپنے قاری کو حیرت اور محبت میں الجھانا جانتا ہو: جیسے افسانہ 'شکیلہ' میں شکیلہ اور شگیلا کا مزہ کچھ مجھ جیسے لوگ ہی محسوس کر سکتے ہیں جو شعبۂ طب کے ساتھ افسانہ نگار بھی ہوں۔ اب دیکھیے شکیلہ ایک نام ہے اور شگیلا ایک جرثومہ۔ اسی طرح کا ایک اور افسانہ 'لپ اسٹک' میں رخسار کو حیرت ہوئی کہ کہانی سننے کے بعد بھی نجو یعنی نجم کو لپ اسٹک سے گھن کیوں نہیں آئی۔

۴۔ تخلیق کار کو غور و فکر کرنے کی عادت اور استعارات پر عبور ہو: جیسے افسانہ 'پیلی لکیر' کے حاجی گو نگے شاہ کو غور و فکر کی عادت تھی۔ اس کی لاش اس پیلی لکیر پر دو دن تک پڑے رہنے کے بعد کنٹرول لائن کے دونوں طرف ایک ایسے معاہدے کی امین ہو گئی جو آج بھی نفرت کے بارود کی بو کو دھونے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔

۵۔ تخلیق کار، خواب اور حقیقت کا فرق جانتا ہو: جیسے افسانہ 'تاریخ کا سبق' کے جمال عزیزی کو اچھی طرح سے اس فرق کا پتہ چل گیا۔

۶۔ تخلیق کار، خاموشی اور گفتار کی رفتار کو بھی جانتا ہو: جیسے افسانہ 'آپ کہاں سے ہیں؟' میں ہم نزار شہابی کی خاموشی سے بھی ملتے ہیں اور اس کی گفتار کی تیز رفتاری سے بھی۔

۷۔ تخلیق کار اپنے کرداروں کی خواہشوں سے بخوبی واقف ہو: جیسے افسانہ 'چوتھا کھلاڑی' میں ہر کردار خواہشوں سے لبریز تھا۔ جس میں جنرل انطونو کمانڈر انچیف کا حلف اٹھالیتا ہے اور باقی آمروں کو جنرل راما کی صورت برج کا چوتھا کھلاڑی مل جاتا ہے۔

میں نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ان سات نکات میں اشرف شاد کی 'پیلی لکیر' کو اختصار کے

ساتھ سمونے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اشرف شآد کو واقعی افسانے لکھنے چاہئیں تھے بلکہ ناول سے بھی پہلے لکھنے چاہئیں تھے کیونکہ انہوں نے کتاب کے آخری حصے میں اپنے ناول کے کچھ اقتباس 'فینٹسی'، 'امید'، 'نواب ٹن کا عجائب گھر' اور 'شرابی' پیش کیے ہیں جو افسانے کا ہی آہنگ لیے ہوئے ہیں۔

ایک چینی کہاوت ہے کہ ایک کتاب پڑھنے سے قاری دس ہزار میل کا سفر طے کرتا ہے۔ یقین جانیے 'پہلی لکیر' کو پڑھتے ہوئے میں نے ایک ایک افسانے میں دس دس ہزار میل کا سفر طے کیا ہے۔ خاص طور پر 'کاش' جو کبھی مجھے دس ہزار فٹ کی اونچائی پر لے گیا تو کبھی اس نے اسی بلندی سے زمین پر پٹک دیا۔

محترم اشرف شآد کے افسانے پڑھنے کے بعد جناب احمد ندیم قاسمی کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ اشرف شآد نے تخلیقی ادب میں سیاسی معاملات کو موضوع بنانے کی نئی توانائی دی ہے۔ اشرف شآد نے ناول بھی لکھے جن میں ان کا اکیڈمی ادبیات پاکستان سے وزیراعظم ایوارڈ یافتہ ناول 'بے وطن'، 'وزیراعظم' اور 'صدرِ محترم' شامل ہیں۔

اشرف شآد کی شاعری بھی بڑی منفرد اور خوش اسلوب ہے۔ ان کے دو مجموعے 'نصاب' اور 'آ مرے قریب آ' شائع ہو چکے ہیں۔ اشرف شآد بہادر اور بے باک صحافی بھی ہیں۔ یقین مانیے اشرف شآد کی قلمی حیات کی یہ ساری جہتیں اور یہ سارے رُخ کوئی حادثاتی نہیں ہیں بلکہ تجربے اور قلمی مشقت سے حاصل کردہ ہیں۔ وہ ایک صاحبِ فکر کالم نگار، ایک بیدار مغز شاعر، ایک حقیقت پسند ناول نگار، ایک خوبصورت آواز والے براڈ کاسٹر اور ایک بے باک صحافی ہیں۔ ان میں قلمی حیاتِ ابدی کے وہ سارے عناصر موجود ہیں جو ان کے ایک کامیاب افسانہ نگار بننے میں مددگار ہیں۔

لکیریں کینوس پر بنی تصویر کی ہوں یا ہاتھوں پر کندہ قسمت کی ہوں ان سب میں ایک ہی قدر مشترک ہے اور وہ ان لکیروں کا بدلتے رہنا ہے۔ اشرف شآد کی 'پہلی لکیر' کی ساری لکیریں زندہ اور متغیر ہیں۔ جتنی بار ان لفظی لکیروں کو پڑھیے ہر بار ایک نئی تصویر تخلیق ہوتی ہے اور یہ کامیابی بہت کم افسانہ نگاروں کے حصے میں آئی ہے۔

(سڈنی میں 'پہلی لکیر' کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا ۲۰۱۲ء)

اشرف شاد کے ادبی سفر کا نیا سنگِ میل

صادق عارف

شاد صاحب کے پہلے ناول 'بے وطن' کی تقریبِ اجراء میں بھی مجھے کچھ کہنے کا موقع ملا تھا۔ اس تقریب میں مقررین کی تعداد مختصر تھی اس لیے میرا مضمون قدرے طویل تھا، مگر اس کے نتیجے میں 'بے وطن' کو ۱۹۹۸ء میں اکادمی ادبیاتِ پاکستان کی طرف سے وزیرِاعظم ادبی ایوارڈ دیا گیا۔ اس تقریب میں مقررین کی تعداد کے پیشِ نظر میں نے طوالت سے مکمل گریز کیا ہے، اس کے باوجود 'پیلی لکیر' کو کچھ نہ کچھ ملنے کا امکان موجود ہے۔

میں نے حسبِ عادت کتاب کی اصل کہانیاں یا افسانے پڑھنے سے پہلے شاد صاحب کا لکھا ہوا 'پیش لفظ' پڑھا، پروفیسر منشایاد صاحب کا مضمون پڑھا، اور اس کے بعد back cover میں درج معروف اہلِ قلم کی آراء کو پڑھا۔ عام حالات میں اک چھوٹا سا تبصرہ لکھنے کے لیے یہ معلومات کافی تھیں۔ مگر شاد صاحب نے از راہِ عنایت تمام احباب کو دو تین ماہ پہلے آگاہ کر دیا تھا لہٰذا میں نے دل جمعی سے تمام افسانوں کو پڑھا۔ اپنے ذہنی وسوسوں کو دور کرنے کے لیے کچھ افسانوں کو دوسری بار پڑھا۔ اس کے باوجود میں ابھی تک منشایاد صاحب کی رائے سے مکمل اتفاق یا اختلاف نہیں کر سکا۔

ناول اور افسانے کی ہیئت اور اسلوب کی تفصیل میں جائے بغیر میں اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ شاد صاحب کے بیشتر افسانے فنی اعتبار سے بہت اچھے افسانے ہیں۔ خاص طور پر 'بدلتے زمانے'، 'ایک کہانی غربت کی'، 'عمر کا حساب' اور 'شکیلہ' نے مجھے متاثر کیا ہے۔ 'لپ اسٹک' کی کہانی

میری سمجھ میں نہیں آئی البتہ' آپ کہاں سے ہیں' اس اعتبار سے خوبصورت افسانہ ہے کہ میں اس کے بنیادی کردار نزار شہبانی سے واقف ہوں۔ اگر چہ شاؔد صاحب نے نام بدل دیا ہے مگر کردار حقیقی ہے اور مجھے اس عرب نژاد شاعر سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔ یہ افسانہ ایسا ہے جس سے ہم میں سے بہت سے لوگ relate کر سکتے ہیں۔

'کاش' بھی بہت اچھا اور پُر اثر افسانہ ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار 'نشاط' یورپ کے آزاد اور جمہوری معاشرے میں پروان چڑھنے والے بہت سے 'انقلابی' نوجوانوں کی نمائندگی کرتی ہے جو انسانیت کی خدمت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں۔ اس افسانے کی جزئیات بھی بہت خوبصورت ہیں اور پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہیں...... مگر افسانے کا انجام ذرا حیران کن ہے۔ اگر چہ نشاط کی حادثاتی موت ناممکنات میں سے نہیں ہے مگر اس کی قبر میں دو سال قبل کی تاریخِ وفات اور چند دن پہلے تک بذریعہ ای میل رابطہ، اپنے گھر آنے کی دعوت، وقت کی کمی اور تین دن کے بعد ایک مظاہرے میں شرکت کے لیے کوپن ہیگن جانے کی تفصیل، کے درمیان رابطہ سمجھ میں نہیں آیا۔ ای میل اگر اس کی کسی سہیلی کی طرف سے ہونے کا کوئی اشارہ کہانی میں موجود نہیں ہے اور نشاط کے کردار میں کوئی ایسی بات بھی نہیں بتائی گئی جس سے اس کے روحانی مقام و مرتبے کا تعین کیا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کاتب نے دو دِن یا دو ہفتے کی بجائے غلطی سے 'دو سال' قبل کی تاریخِ فات لکھ دی ہے۔

'چوتھا کھلاڑی' اور 'تاریخ کا سبق' سیاسی کہانیاں ہیں۔ ان پر زیادہ تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ 'تاریخ کا سبق' پاکستان کے سیاسی شب و روز بلکہ تاریخ کی اچھی تمثیل ہے مگر اس میں روم کے بادشاہ Domition کی مثال دی گئی ہے جسے اس کے ظلم اور آمریت کے نتیجے میں قتل کر دیا گیا تھا۔ ڈومیشن ۵۱ء میں پیدا ہوا، ۸۱ء میں اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے بعد روم کا بادشاہ بنا، ۸۵ء تک اس نے انگلینڈ کو مکمل طور پر فتح کر کے رومن سلطنت کا حصہ بنا دیا۔ مگر ۹۱ء کے بعد اس نے ظلم و ستم اور آمریت کا رویہ اختیار کر لیا جس کے نتیجے میں اسے اس کے دربار میں، اس بیوی اور قریبی درباریوں سمیت قتل کر دیا گیا۔ تھوڑی مزید کوشش کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے محل میں گھڑیاں نہیں تھیں بلکہ اس وقت دیوار پر لگانے والی ہاتھ پر باندھنے والی کوئی گھڑی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ اس حوالے پر نظرِ ثانی کر لی جاتی تو افسانے کا تاثر شاید زیادہ گہرا ہوتا۔

’پہلی لکیر‘ اس کتاب کا غالباً سب سے اہم افسانہ ہے اور کتاب کا عنوان بھی ہے۔ اس افسانے کا بنیادی کردار حاجی گونگے شاہ ہے اور ساری کہانی کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ اس افسانے کی تمام جزئیات، کشمیر کے سماجی اور سیاسی حالات کی صحیح عکاسی کرتی ہیں...... مگر میں کوشش کے باوجود اس افسانے کے انجام کو نہ سمجھ سکا ہوں اور نہ اس سے ذہنی طور پر اتفاق کر سکا ہوں۔ بلکہ ’پہلی لکیر‘ کے پس منظر سے طبیعت میں جو انقباض پیدا ہوتا ہے اسے قبول کرنے یا اس سے سمجھوتا کرنے کی کوئی تاویل میری سمجھ میں نہیں آتی۔ شآد صاحب ایک کہنہ مشق شاعر اور ادیب ہیں، بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں اور تحریر کے جمالیاتی پہلوؤں سے مکمل طور پر واقف ہیں، وہ یقیناً اس افسانے کا انجام، اس سے بہتر سوچ اور لکھ سکتے تھے۔

یہ کتاب اشرف شاد صاحب کے ادبی سفر کا ایک نیا سنگِ میل ہے، میری ذاتی رائے یہی ہے کہ انہیں مزید افسانے لکھنے چاہئیں۔ اشرف شآد یقیناً ’خیال کو حقیقت کا روپ دینے اور تلخ حقیقت کو افسانوی تحیر عطا کرنے کا فن جانتے ہیں‘۔

’اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ‘

(سڈنی میں ’پہلی لکیر‘ کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا ۲۰۱۲ء)

اشرف شاد: آسٹریلیا میں ادبی تحریک کے محرک

ڈاکٹر شبیر حیدر

اشرف شاد سے میرا پہلا رابطہ سڈنی کے ایک مشاعرے میں ہوا، جس میں ہم اپنی ٹوٹی پھوٹی شاعری میں منہمک تھے کہ ایک آواز آئی کہ یہاں پر پاکستان سے ایک نو وارد شاعر تشریف فرما ہیں۔ چنانچہ جناب اشرف شاؔد صاحب کو اسٹیج پر مدعو کیا گیا۔ جب انہوں نے اپنی خوبصورت غزل مسحور کن ترنم میں پڑھنا شروع کی تو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ سڈنی میں کوئی شاعر، مشاعرہ پڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد فرمائشوں کا سلسلہ چلا اور شاؔد صاحب کو کئی غزلیں سنانا پڑیں۔ میں اشرف شاد کی نئی کتاب 'پیلی لکیر' کے بجائے ان کے باقی رنگوں کی بات کروں گا جو قوسِ قزح کی طرح ان کی شخصیت میں اجاگر ہیں۔ اشرف شاؔد ایک باوقار اور پُرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ نرم طبیعت رکھتے ہیں، ملنسار ہیں اور لوگوں کے دل کے قریب رہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جس کے ہم سب گرویدہ ہیں اور اسی لیے اس محفل میں شریک بھی ہیں، جیسا کہ اشرف شاؔد نے خود کہا ہے ؎

جو بھی کچھ لکھا گیا، عشق کے نصاب میں
مرکزی خیال تھا، آ مرے قریب آ

سڈنی اور آسٹریلیا میں اردو کے فروغ اور اس سے منسلک پروگرام، مشاعروں کا انعقاد، پاکستان اور ہندوستان کے شاعروں کی آسٹریلیا میں آمد، آسٹریلیا کے شاعروں کا شعری مجموعہ اور آج جو سڈنی میں اتنے شاعر اور ادیب بیٹھے ہیں ان سب چیزوں اور تحریک میں اشرف شاؔد صاحب کی شخصیت کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے سڈنی میں آنے سے اردو کی تنظیم کو ایک تحریک ملی۔ ان کے تجربے، علم اور شوق نے ہمیں تقویت دی اور اس کے نتیجے میں سالانہ مشاعرے کا آغاز ہوا، اور

تقریباً پاکستان سے ہر مشہور شاعر اور ہندوستان سے کئی منفرد شعرا یہاں تشریف لائے۔ اشرف شاؔد کی رہنمائی میں سڈنی، کینبرا، میلبورن اور کوئینز لینڈ بلکہ نیوزی لینڈ تک مشاعرے منعقد ہوئے۔

آپ کی ذات میں حبّ الوطنی اس طرح کُوٹ کُوٹ کر بھری ہے کہ کویت، امریکہ، آسٹریلیا، دوبئی اور برونائی، آپ کی پرواز جہاں جہاں بھی رہی ہے، ان کی واپسی پاکستان میں ہی ہوتی ہے ؎

اِک شاؔد ہی نہیں جو وطن چھوڑ کر بکا
کتنے گھروں کا مال دکانوں تک آ گیا

چنانچہ شاعری سے نثر تک، آپ کے موضوعات کی روح ان کی وطن سے محبت اور وطن کے لوگوں سے پیار ہے۔ 'بے وطن' ناول سے شروع ہوکر، 'وزیرِ اعظم' اور 'صدرِ محترم' تک، آپ کے خیالات کی پتنگ ان ہی پیچوں میں الجھی نظر آتی ہے۔ اس سفر میں خوشیاں کم اور غم زیادہ رہے ہیں۔ مگر اشرف شاد تھکے نہیں ؎

کچھ اور منزلوں کا سفر پیش آ گیا
اُتری نہیں تھی پچھلے سفر کی تھکن ابھی

کالج کے زمانے سے صحافت، آپ کے خون کی شریانوں میں دوڑنا شروع ہوئی، انقلابی طبیعت اور نڈر پن نے آپ کو جیلوں کی بھی سیر کرائی لیکن ایک سچے صحافی، شاعر اور نثر نگار کی یہی پہچان ہے کہ وہ جو دیکھتا ہے، سنتا ہے، وہ کہتا ہے۔ اشرف شاؔد نے نہ ذاتی خواہش کی بنا پر اور نہ ہی ڈر و خوف کی بنا پر بلکہ صرف اور صرف خیالی قوت اور شاعرانہ ذوق کی بنا پر، وطن کی محبت میں خود کو رنگ کر دیکھا ہے۔ بقول پروفیسر جگن ناتھ آزاد' ان کے کلام میں دلکشی، تازگی، شگفتگی، نغمگی اور انفرادیت ہے اور وہ اپنا ایک الگ رنگ رکھتے ہیں۔'

اشرف شاؔد کی ساری زندگی ادبی کاوش میں گزری ہے۔ تخلیقی سفر میں وہ پوری لگن اور محنت کے ساتھ مصروف رہے ہیں۔ انہوں نے دنیاوی مفاد کو بالائے طاق رکھ کر نہایت جانفشانی سے ادب کی خدمت کی ہے۔ اس میں ان کی شریکِ حیات محترمہ ڈاکٹر یاسمین شاؔد کا بہت بڑا ہاتھ ہے، جو کہ خود بھی ادیبہ اور شاعرہ ہیں۔ جب ہم سفر ایسا مل جائے، تو سفر اچھا بھی کٹتا ہے، اور آسان بھی ہو جاتا ہے۔ اس لیے بھابی جان بھی قابلِ تحسین ہیں اور شاؔد کے پھولوں کی خوشبو بھی وہی ہیں۔ میری اور تمام دوستوں کی دعا ہے۔ اللہ اشرف شاؔد کو صحت اور لمبی زندگی دے اور ان کے قلم میں زور اور تُندی اسی طرح برقرار رہے۔

(سڈنی میں 'پہلی لکیر' کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا مضمون ۲۰۱۲ء)

صدر جنرل ضیاء الحق کا انٹرویو لیتے ہوئے (ایوانِ صدر اسلام آباد ۱۹۸۸ء)

وزیر اعظم نواز شریف سے وزیر اعظم ادبی ایوارڈ لیتے ہوئے (۱۹۹۸ء)

الطاف حسین سے ان کی عزیز آباد کی قیام گاہ پر انٹرویو لیتے ہوئے (۱۹۸۸ء) ۔

پرنس کریم آغا خان، پیار علی الانہ کے ساتھ (۱۹۷۶ء)

ایئر پورٹ پر عیدی امین کا انٹرویو لینے کے بعد (۱۹۷۳ء)
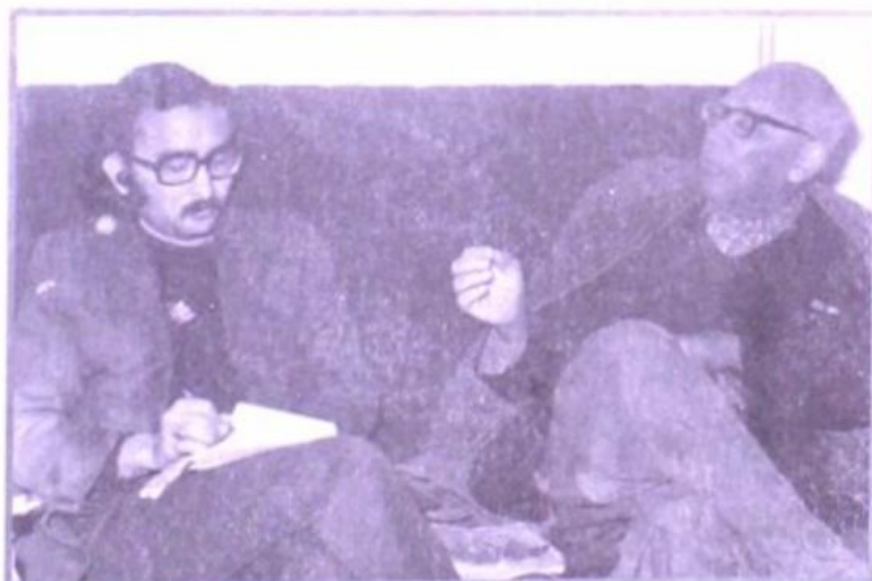
آزاد کشمیر کے وزیر اعظم عبدالحمید خان کا انٹرویو لیتے ہوئے (۱۹۷۷ء)
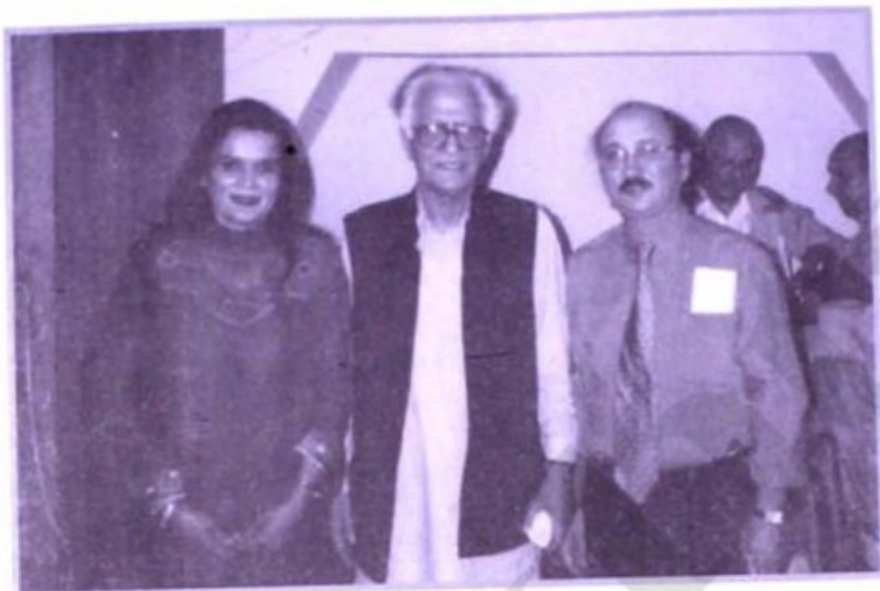
احمد ندیم قاسمی کے ساتھ (لاہور ۱۹۹۹ء)

احمد فراز کے ساتھ سڈنی کی قیام گاہ میں (۲۰۰۰ء)

قتیل شفائی کے ساتھ نیو کیسل کی قیام گاہ میں (۱۹۹۹ء)

'صدرِ محترم' اور 'آ مرے قریب آ' کی تقریب میں دائیں سے بائیں: یاسمین، سحر انصاری، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، شفیع نقی، مشتاق احمد یوسفی، نقاش کاظمی، اشرف شاد، شہناز احد، سینیٹر رخسانہ زبیری

’بے وطن‘ کی رسمِ اجرا، پر شوکت صدیقی کے ساتھ (۱۹۹۷ء)

’نصاب‘ کی رسمِ اجرا، پر حمایت علی شاعر، نقاش کاظمی اور حسن عابدی کے ہمراہ (۱۹۹۶ء)

’آمرے قریب آ‘ کی تقریبِ رونمائی میں، سحر انصاری، امجد اسلام امجد،
پیرزادہ قاسم، یاسمین

ابوظہبی کے مشاعرے میں ندا فاضلی، ندیم، احمد فراز اور دیگر کے ساتھ (۲۰۰۴ء)

ابوظہبی کے مشاعرے میں ہندوستان اور پاکستان کے شعراء کے ہمراہ (۲۰۰۴ء)

'بے وطن' کی رسمِ اجراء پر شکیل عادل زادہ، شوکت صدیقی، سحر انصاری، نقاش کاظمی،
شفقت بیگ، احمد شمسی، جی این قریشی اور دیگر

احمد شمسی اور بشیر مرزا کے ساتھ ایک یادگار تصویر (۱۹۹۶ء)

'MEYAAR PUBLICATIONS'

POST BOX 3195, KARACHI-29

نبض چپ چاپ کھڑی ہے یارو　　یہ گھڑی کون گھڑی ہے یارو

اگست ۱۹۷۸ء میں چار صحافیوں کی گرفتاری کے موقعے پر ہفت روزہ 'معیار' میں شائع ہونے والا بیک پیج۔ موسیٰ جی دیپک، محمود شام (اوپر)۔ لالہ رخ، اشرف شاد (نیچے)

ڈاکٹر یاسمین شاد، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم اور ایوب خاور کے ساتھ (دبئی ۲۰۰۴ء)

ڈاکٹر شبیر حیدر، اوم کرشن راحت، عباس جیلانی اور نذر امروہوی (کینبرا ۲۰۰۳ء)

سڈنی کے مشاعرے میں ڈاکٹر بدر قادری، اشرف شاد، کنیز فاطمہ، خواہ مخواہ (سڈنی ۱۹۹۱ء)

انٹرویوز

فنکار اب بھی مستور ہے

❖ آپ بہ حیثیت ناول نگار، اردو عالم میں شہرت رکھتے ہیں، سب سے پہلے آپ اپنا ادبی پس منظر اور اپنے خاندان کا تعارف کروائیے۔

● میرا تعلق کسی ادبی گھرانے سے تو نہیں ہے لیکن گھر میں اردو کی ثقافت رائج تھی۔ میری والدہ کا تعلق ایک علمی گھرانے سے تھا جہاں تعلیم کو ہر چیز پر فوقیت حاصل تھی۔ میری اردو کی ابتدائی تربیت بھی اپنی والدہ کے ہاتھوں ہوئی۔ میرے آباؤ اجداد ۱۸ ویں صدی میں وسطی ایشیا سے ہندوستان آئے تھے اور ان کا تعلق آذربائیجان کے ترک نژاد مغل قبیلے جوال شیر سے تھا۔ مراد آباد شہر کے محلہ مغل پورہ میں ہماری وہ آبائی حویلی اب بھی موجود ہے جو نسل در نسل، تقسیم در تقسیم عمل سے گزر کر کھولیوں میں بٹ گئی ہے۔ مراد آباد جا کر اسے اس حال میں دیکھنا ایک تکلیف دہ تجربہ تھا۔ میرے دادا مرزا علی نظر بیگ مولانا اشرف علی تھانوی کے عقیدت مندوں میں تھے اور میرا نام اشرف ان کی اسی عقیدت کا اظہار تھا۔ میرے دادا کٹر انگریز دشمن تھے اور انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی کسی اولاد کو انگریزی نہیں پڑھنے دی کیونکہ وہ انگریزی کو کفر کی زبان سمجھتے تھے۔ میں ان کی روح سے شرمندہ ہوں کہ میں اپنی روزی انگریزی درست کرنے کی مزدوری کر کے کما رہا ہوں۔ میری ننھیال کا تعلق مولوی سیّد گھرانے سے تھا اور میرے نانا حکیم سیّد ہاشم علی میرے دادا کے برعکس انگریزی تعلیم سے آراستہ تھے اور مراد آباد میں اپنا مطب کرتے تھے۔ دادا کے انتقال کے بعد والد زمین اور جائیداد کے تنازعوں اور مقدمہ بازی میں الجھ گئے تھے اور میری والدہ کا خیال تھا کہ مغلوں کی اس جنگ میں بچے تعلیم سے محروم رہ جائیں گے، اس لیے ہم ہجرت کر کے ۱۹۵۲ء میں پاکستان آ گئے۔

❖ آپ میں یہ احساس کس طرح جاگا کہ آپ نثر لکھ سکتے ہیں، سب سے پہلے آپ نے کیا لکھا اور وہ کہاں شائع ہوا؟

● یہ کوئی اچانک جاگنے والا احساس نہیں تھا۔ نثر لکھنا ہمارے یہاں ایک فطری وصف اور ہماری تعلیم کا بنیادی حصہ تھا۔ میری نثر بھی تینوں بنیادی اوصاف کی حامل تھی۔ درست املا، مربوط جملے اور خوش خطی۔ تعلیمی ضروریات سے ہٹ کر ادبی نثر کب اور کیسے لکھنا شروع کی، اس کا صحیح تعین مشکل ہے۔ یہ ایک بتدریج عمل تھا۔ میں نے کتب بینی بہت کی۔ میرے والد اسکول میں پڑھاتے تھے اس لیے اسکول کی لائبریری سے کتابیں حاصل کرنا آسان تھا۔ میں نے گرمیوں کی دو مہینوں کی چھٹیوں میں اردو ادب کی وہ تمام کتابیں پڑھ ڈالی تھیں جو لائبریری میں موجود تھیں۔ اس وقت میری عمر بارہ سال تھی۔ اسکول میں مضمون نویسی کے مقابلے میں پہلا انعام ملا تو ہمت بندھی۔ کالج آیا تو اخباروں کے تعلیمی صفحات پر لکھنے لگا، شام کے ایک اخبار میں ہفتہ وار کالم بھی لکھنے کو مل گیا۔ موزوں طبع تھا، ماحول میسر تھا اور ترنم بھی اچھا تھا اس لیے شاعری بھی چل نکلی۔ ادبی سرگرمیاں اپنے شباب پر تھیں کہ تلاشِ معاش نے صحافت کی نذر کر دیا۔ صحافت ادب کو نگل جاتی ہے۔ صحافت تخلیقی عمل نہیں ہے لیکن لکھنے کی ساری توانائیاں جذب کر لیتی ہے۔ اس وقت میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔

❖ آپ کے معاصرین میں ایک ادبی کہکشاں روشن ہے تو آپ نے خود کو ان سب سے نمایاں کرنے کے لیے کیا ادبی اقدامات کیے؟

● میرے لیے یہی بہت اعزاز کی بات ہے کہ میں اس عہد میں زندہ ہوں جس میں یہ کہکشاں روشن ہے۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جن سے میرا محبت اور دوستی کا رشتہ ہے میں ان میں خود کو نمایاں کرنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ میری اپنی حدود ہیں جن میں رہتے ہوئے تخلیقی اور تحقیقی کام کر رہا ہوں۔ مجھے اشفاق حسین کا شعر یاد آ رہا ہے۔

جو شوق بھی ہو اس سے گریزاں نہیں رہنا
لیکن مری مانو تو نمایاں نہیں رہنا

❖ آپ کے ادبی آفاق میں، شاعری، ناول نگاری اور صحافت شامل ہیں لیکن آپ بنیادی طور پر خود کو کس صنف سے وابستہ پاتے ہیں؟

- ابتدا شاعری اور نثر نگاری سے ہوئی تھی جس نے صحافت میں داخلے کا راستہ ہموار کیا تھا لیکن پھر صحافت ہی میری پہچان بنی۔ شاعری میری گنگناہٹ ہے، ناول نگار کی حیثیت سے بھی میری عمر چودہ پندرہ برس ہے لیکن صحافت سے میری وابستگی چالیس سے زیادہ برسوں پر محیط ہے۔ ان سالوں میں بہت حشر سامانیاں بھی چھپی ہیں۔ یہی میری اولین شناخت ہے۔

❖ آپ کی شاعری کے مجموعے ''آمرے قریب آ'' اور ''نصاب'' آپ کے تین ناولوں کے نیچے دب گئے اور آپ کو احساس بھی نہیں ہوا، کیا آپ کو ان کے پس منظر ہو جانے کا ملال نہیں ہے؟

- قطعی نہیں! میرا شعری مجموعہ شائع کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں سمجھتا تھا میں ابھی تیار نہیں ہوں۔ لیکن دوستوں کا خیال تھا کہ اس بہانے میرا کلام محفوظ ہو جائے گا اس لیے میری جو بھی اچھی بری شاعری تھی ''نصاب'' میں جمع کر دی گئی۔ ''آمرے قریب آ'' کے نام سے دوسرا مجموعہ میری دربدری کے نئے آغاز پر شائع ہوا۔ ''حرفِ رفوگر'' کے عنوان سے لکھے گئے پیش لفظ کے چند جملے نقل کرنے کی اجازت دیجیے اس سے بات اور واضح ہو جائے گی۔ ''...... آمرے قریب آ میری صحافت اور ناول نگاری سے ادھار لیا ہوا ایک وقفہ ہے، ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا، خوشبوؤں کا جزیرہ، ایک بھولا ہوا سپنا۔ شاعری پہلی محبت کی طرح ہوتی ہے جو ناکام ہو کر بھی عمر بھر کسک دیتی رہتی ہے۔ یہ خواب دیکھنے کا عمل ہے جو نظر نہ آئیں تو زندگی بے رنگ ہو جاتی ہے۔ شاعری میرا رومانس ہے، میں اس پر دعویٰ نہیں کر سکتا۔ شاعری کا آبگینہ دعوؤں کی سخت گیری کا متحمل ہو بھی نہیں سکتا۔ مجھے ہلکے سروں میں گنگنانا اچھا لگتا ہے۔ آمرے قریب آ میری یہی گنگناہٹ ہے۔''

❖ بحیثیت ناول نگار آپ کو جو شہرت ملی وہ شاعری سے نہیں ملی کیا سوچتے ہیں آپ؟

- شاعری کے حوالے سے آپ کے پچھلے سوال کے جواب میں جو کہہ چکا ہوں وہ کافی ہے۔ ناول نگار کی حیثیت سے ملنے والی شہرت کی ایک وجہ میری یہ خوش قسمتی بھی ہے کہ جس سال بے وطن شائع ہوئی اس سال حکومت کو ادیبوں کی سرپرستی کا اچانک خیال آیا تھا اور وزیراعظم ادبی ایوارڈ کا اعلان ہوا تھا۔ میں اسی پر خوش تھا کہ میری کتاب منتخب ہونے والے ناولوں کی مختصر فہرست میں شامل کر لی گئی تھی۔ اسے بہترین ناول کا انعام ملا تو فخر کا

احساس بھی جاگا۔ اس لیے بھی کہ اسے انعام کا مستحق سمجھنے والے منصفین میں احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی، مشتاق احمد یوسفی، انتظار حسین اور مشفق خواجہ جیسے مشاہیر شامل تھے۔ کتابوں کی ذرائع ابلاغ پر کافی تشہیر ہوئی۔ ایوارڈز کی تقسیم کی تقریب بھی بہت بڑے پیمانے پر ہوئی۔ خود وزیراعظم نے ایوارڈ تقسیم کئے۔ پورے شہر میں ایوارڈ حاصل کرنے والوں کے لیے بڑے بڑے تہنیتی بینرز لگے تھے۔ تقریب براہ راست ٹی وی پر نشر ہوئی۔ یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح بے وطن کو تشہیر کے وہ مواقع ملے جو عموماً میسر نہیں آتے۔ اس طرح کتاب وسیع حلقے تک پہنچی اور پڑھی گئی۔ شہرت سرحد پار بھی گئی اور ہندی کے مشہور پبلشر راج کمل نے اس کے حقوق حاصل کر کے اس کا ہندی ترجمہ شائع کیا۔ وزیراعظم کو بھی کافی پذیرائی ملی اور کراچی، لاہور اور اسلام آباد کے علاوہ نیو یارک، لاس اینجلس، ٹورنٹو، سڈنی اور ملبورن میں اس کی شاندار تعارفی تقاریب ہوئیں اور اس طرح اس ناول کی بھی دور دور تک پہنچ ہوئی۔ صدر محترم کچھ تاخیر سے چند سال پہلے شائع ہوئی ہے۔ دوست پبلیکیشنز جو میری کتابیں شائع کرتے ہیں ان کا کتابوں کی تقسیم کا اپنا نظام ہے جس کی وجہ سے دنیا بھر میں میری کتابوں کی پہنچ اچھی ہے۔

❖ آپ کا دماغ سمندروں سمندر، ہمہ وقت تخلیقی ہیجان، سے مملو رہتا ہے، اس میں ناول، شاعری، افسانے، صحافت، بے باک قلم، ان تمام کو ایک وجود میں کس طرح سنبھالے ہوئے ہیں۔

● آپ نے صحیح کہا ''ہمہ وقت تخلیقی ہیجان'' سے دماغ میں جھکڑ چلتے رہتے ہیں۔ ایک پریشانی یہ بھی ہے کہ وقت کم اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ دماغ میں جو کچھ بھرا ہے اسے کاغذ پر منتقل کرنے کی رفتار آج کل سست ہے۔ اس اعتبار سے مجھے آسٹریلیا کا موسم راس آیا تھا، امارات کا نہیں، جہاں تک بے باکی کا معاملہ ہے وہ اب سرشت میں شامل ہے۔ ادب ہو یا صحافت، بلا جھجک لکھا اور قلم کو شرمندہ نہیں ہونے دیا۔

❖ آپ کے یہاں جو سیاسی شعور اور فکری توانائی ہے وہ آپ کو کہاں سے حاصل ہوئی؟

● یہ ایک مسلسل جاری رہنے والا عمل ہے۔ صرف پڑھنا کافی نہیں ہے، فکر و عمل میں تال میل بھی ضروری ہے۔ مکالمہ بھی جاری رہنا چاہیے۔ بے عملی توانائی نہیں دیتی، نہ فکر کو نہ شعور کو۔

❖ شاعری اور افسانے کے لیے مصروفیات میں سے وقت چرایا جا سکتا ہے، لیکن ناول، محنت طلب، یکسوئی خواہ، کام ہیں، آپ نے تین ناولوں کو لکھنے میں خود کو کس طرح مرتب کیا؟

● آپ صحیح کہتے ہیں شاعری چلتے پھرتے ہو سکتی ہے۔ میں اپنی شاعری کی بات کر رہا ہوں، ان دوستوں کی نہیں جو بہت جم کر شاعری کرتے ہیں۔ افسانے بھی معمول کی بھاگ دوڑ سے وقت چرا کر چند نشستوں میں مکمل کیے جا سکتے ہیں لیکن ناول کے اندر رہنا پڑتا ہے۔ لکھنے میں تسلسل نہ رہے تو کردار بے قابو ہو جاتے ہیں، شریر بچوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگ نکلتے ہیں۔ دشواریاں تو تھیں لیکن میں نے ڈسپلن قائم رکھا اور پابندی سے لکھتا رہا۔ چکی کی مشقت سے جو وقت بچا، یا ہفتہ وار چھٹی کے دن۔ زندگی میں ابھی تک سکون کا وہ دور نہیں آیا جب مکمل یکسوئی کے ساتھ تمام وقت صرف تخلیقی سرگرمیوں پر صرف کیا جا سکے۔ یہ میرا ہی نہیں ہمارے اکثر تخلیق کاروں کا مسئلہ ہے کہ وہ اپنی زبان میں کتنا ہی اعلیٰ ادب تخلیق کر لیں، انہیں پیٹ پالنے کے لیے کچھ نہ کچھ اور کرنا پڑتا ہے۔ صحافت کی طرح میری ادبی تخلیقات بھی میرے اہل و عیال کی قرض دار ہیں جن کا وقت چرا کر اپنی ادبی سرگرمیوں کو دیتا رہا ہوں۔

❖ آپ نے ہجرتوں کے ذائقے چکھے ہیں، ہندوستان سے پاکستان، پھر آسٹریلیا اور اب عرب امارات، تو اس اسفار نے آپ کی شخصیت پر کیا اثرات مرتب کیے؟
خلیجی ممالک اور امریکہ کے اسفار کی نوعیت کیا تھی؟ ان میں آپ کے تجربے اور مشاہدے کیا تھے؟

آپ کے افسانوں میں، ہجرت در ہجرت مسائل بھی کینوس ہوئے ہوں گے، کچھ ایسے دلچسپ واقعات بتائیے، جو آپ کے افسانوں میں کہانی بنے؟

● ذہن کے آفاق پھیلے، نئی دنیائیں دیکھنے کو ملیں۔ کسی نئے معاشرے کو اس میں رہ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے صرف سیاحت کر کے نہیں۔ پہلی بار یورپ گیا تو وہ ایک دنیائے حیرت تھی۔ یہ محض یورپ کی خوب صورتی سے سحر زدہ ہونے کا معاملہ نہیں تھا۔ میں انسانی رشتوں کے نئے رنگ ڈھنگ دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ میں صحافت کا ایک کورس کرنے گیا تھا۔ افریقہ، عرب دنیا، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے تقریباً بیس صحافی اس کورس میں

میرے شریک تھے۔ میں نے پہلی بار رنگ ونسل کی ایسی تفریق اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ عربوں اور افریقیوں کے درمیان تناؤ بہت شدید تھا۔ وہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ صدیوں پرانے زخم آج بھی تازہ تھے۔ سفید فاموں کے خلاف سیاہ فاموں کی گہری نفرت کا بھی چشم دید تجربہ ہوا۔ تنزانیہ کے ایک صحافی میرے قریبی دوست بن گئے تھے۔ انہوں نے مجھے اخبار کے چیف ایڈیٹر کا خط سنایا جس میں انہوں نے اپنے دوست کو لکھا تھا کہ زیادہ سے زیادہ سفید فام حسینائیں فتح کر کے صدیوں پرانی غلامی کا انتقام لو۔ یہ انہوں نے مذاق میں نہیں پوری سنجیدگی سے لکھا تھا۔ ہم ایک دور دراز گاؤں کے دورے پر گئے۔ اس کے باسیوں نے کبھی کوئی سیاہ فام شخص نہیں دیکھا تھا۔ ایک بچے نے قریب آ کر گھانا کے ہمارے ایک ساتھی کا ہاتھ رگڑ رگڑ کر رنگ چھڑانے کی کوشش کی۔ اسے اس واقعہ کا اتنا صدمہ ہوا کہ وہ کورس بیچ میں چھوڑ کر گھانا واپس چلا گیا۔ یہ ۱۹۷۴ء کا زمانہ تھا جب ویت نام کی جنگ اپنے آخری مرحلے میں تھی۔ چار یا شاید پانچ ویت نامی صحافی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ان میں ایک نازک سی پھول جیسی لڑکی بھی تھی، ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ پتیاں نہ بکھر جائیں۔ معلوم ہوا کہ وہ ویت نام کے جنگلوں میں ویت کانگ چھاپہ ماروں کے ساتھ امریکی فوجیوں کے خلاف لڑتی رہی ہے۔ آگ اور خون میں بھرے کارنامے وہ اس طرح مسکرا کر سناتی تھی جیسے سنڈریلا محل کی سیر کا قصہ کہہ رہی ہو۔ نیو یارک گیا تو وہاں لاطینی امریکہ اور فلسطین کی تحریکوں سے وابستہ ادیبوں اور نظریاتی کارکنوں سے رابطے بنے۔ آزادی اظہار اور انسانی حقوق کی امریکی تنظیموں سے تعلق ہوا۔ اس سے آزادی کے لیے لڑنے اور آزادی برتنے کا نیا چلن سیکھا۔ انسانی تعلقات کے تضادات بھی دیکھے۔ ترکی کی ایک لڑکی میری دوست تھی وہ کسی جنرل کی بیٹی تھی اور کولمبیا یونیورسٹی میں ایم بی اے کرنے آئی تھی۔ پھر وہ سب کچھ چھوڑ کر فلسطینی تحریک سے اس طرح وابستہ ہوئی کہ اپنا تن من دھن لٹا دیا۔ پھر یہ بھی ہوا کہ اس نے ایک یہودی سے شادی کر لی۔ ترکی کی یہ لڑکی صدر محترم کا ایک بہت جان دار کردار ہے۔ بحرین اور کویت میں رہا تو وہاں کا کثیر القومی چہرہ بالکل ہی مختلف تھا۔ انسانی تعلقات کا چلن اور شناخت کے پیمانے بھی مختلف تھے۔

خلیجی ممالک کی رہائش معاشی ہجرت کی انتہائی شکل ہے۔ میں نے افتخار عارف کے اس مشہور شعر کی تفسیر یہیں دیکھی۔

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا، ہماری ہجرت کیا

اس زمانے کی میری ایک غزل کا مقطع تھا۔

اک شاؔد ہی نہیں جو وطن چھوڑ کر بکا
کتنے گھروں کا مال دکانوں تک آ گیا

بیس سال سے اب آسٹریلیا میرا گھر ہے جو زمین کا بالکل نچلا سرا ہے اور یہاں زندگی گذارنے اور اسے بہتر بنانے کی جدوجہد خلیجی ممالک کی نسبت بہت مختلف ہے۔ اس جدوجہد کی کہانیاں ''بے وطن'' میں شامل ہیں۔ آج کل امارات میں مقیم ہوں۔ یہ بھی عارضی رہائش گاہ ہے۔ یونیورسٹی کے ان علماء کے ساتھ کام کرنا جو دنیا بھر میں اپنے تحقیقی کام کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں، ایک نیا اور خوش گوار تجربہ ہے۔

❖ شاعری آپ کا بنیادی تخلیقی وصف ہے یا نثر نگاری؟

● میں ہمیشہ اپنے دوستوں اور خود اپنے آپ کو یاد دلاتا رہتا ہوں کہ میں بنیادی طور پر نثر نگار ہوں۔

❖ شعری مجموعے ''آ مرے قریب آ'' اور ''نصاب'' سے کچھ منتخب شعر سنائیے وہ جنہیں آپ اپنے لیے فخر کہہ سکیں؟

● میں نہیں سمجھتا کہ اب تک کوئی ایسا شعر کہا ہے جس پر فخر کیا جا سکے۔ میرے لیے فخر کی بات یہ ہوتی ہے اگر کسی کو میرا کوئی شعر پسند آ جائے۔ آپ نے مجھے میرا ایک مطلع یاد دلایا ہے دہرا دیتا ہوں۔

میں نے تم سے کب کہا، مجھ سے کچھ کہا کرو
بس ہوا کے سامنے ہونٹ رکھ دیا کرو

طالب علمی کے زمانے میں ایک شعر بہت مشہور ہوا تھا جو ایک زمانے تک میری شناخت رہا ہے، وہ بھی سن لیجیے۔

مجھ کو بھی پڑھ کتاب ہوں مضمونِ خاص ہوں
مانا ترے نصاب میں شامل نہیں ہوں میں

❖ آپ کے ناول پاکستان کی سیاست کی داستان سناتے ہیں۔ ''صدر محترم''، ''وزیر اعظم''، ''بے وطن'' اور اب ایک نیا ناول ''جج صاحب'' اور انگریزی میں ناول شائع ہونے والا ہے۔ یہ سارے ناول اپنے نام سے لگتے ہیں کہ آپ نے پاکستان کے روز و شب اور اس کے سیاسی گلیاروں کی سیر بھی کی ہے۔ اس کی پاداش میں آپ کو جیل بھی جانا پڑا ہے۔ تھوڑی سی تفصیل دیجیے؟

● مجھ پر میرے ناولوں کی وجہ سے کوئی عذاب نہیں آیا۔ ایک تو اس لیے کہ میں پاکستان میں رہتا نہیں ہوں اور اس لیے بھی کہ پاکستان میں پڑھنے کا رواج کم ہے۔ چھپے ہوئے لفظ کا اثر بھی نہیں رہا۔ صاحبانِ اختیار اپنے کام سے کام رکھتے ہیں، کوئی کچھ لکھتا رہے انہیں زیادہ پروا نہیں ہوتی۔ میں دو بار جیل گیا اور دونوں بار جیل جانے کی وجہ میری صحافیانہ سرگرمیاں تھیں۔

❖ جیل میں آپ کے روز و شب کی مصروفیات کی تھیں؟

● صحافیوں اور سیاسی کارکنوں کے لیے جیل کی زندگی بہت دشوار نہیں ہوتی۔ حکام صحافیوں سے خائف رہتے ہیں اس لیے خیال رکھتے ہیں۔ سمجھئے کہ باہر کی بہت مصروف زندگی سے بچنے اور کچھ عرصے آرام کرنے کا وقفہ تھا۔ مشکلات میں ہمارے وہ چاہنے والے رہے جو جیل سے باہر تھے۔ جیل میں ہمارے ساتھی صحافی دوستوں کی بڑی تعداد تھی اس لیے بھی وقت اچھا گزرتا تھا۔

❖ جیل میں قیدیوں کے درمیان، تال میل کے بارے میں بتایئے؟

● کم مدت کی جیل تھی پھر بھی چھوٹے چھوٹے بے شمار قصے ہیں۔ حیدرآباد کی جیل میں جہاں ہم کراچی جیل سے منتقل کر دیے گئے تھے پاکستان کا ایک مشہور ڈاکو محمد خان عمر قید کاٹ رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی جیل کے ہسپتال میں تھی۔ ہم نے کوئٹہ کے ایک نوجوان دوست کو جو ہمارے ساتھ جیل میں تھے تیار کیا، وہ کسی بہانے ہسپتال میں داخل ہوئے اور محمد خان ڈاکو کی زندگی کی کہانیاں لکھ لائے۔ محمد خان نے ایک خزانے کا نقشہ بھی بنا کر دیا جہاں اس کے

مطابق اس کی لوٹ کا مال دفن تھا۔ جیل سے باہر آنے کے بعد زندگی کی گردش اتنی تیز تھی کہ محمد خان کی وہ کہانی اَن لکھی رہ گئی جسے ہم اپنے رسالے میں قسط وار شائع کرنا چاہتے تھے۔ خزانے کا نقشہ بھی ایک ڈاکو کا مذاق سمجھ کر پھینک دیا۔ خزانے کی کہانی صحیح بھی تھی تو اسے اب بازیاب کرنا ممکن نہ ہوتا کیونکہ وہ وزیرستان کے ایک ایسے علاقے سے ہے جو طالبان کا گڑھ ہے۔ ایک نوجوان قیدی تھا جس کی ڈیوٹی ہماری بیرک کے کچن میں تھی۔ اسے کوڑوں کی سزا تھی۔ ہم نے کوڑے لگانے والے سپاہی سے سفارش کی جس نے بازو دبا کر اس طرح کوڑے لگائے کہ نوجوان کی کمر کو نقصان نہیں پہنچے۔ ہم دوستوں کے بھیجے ہوئے سگریٹوں اور کھانے پینے کی چیزوں کا بڑا حصہ قیدیوں میں تقسیم کر دیتے تھے جس کی وجہ سے قیدیوں میں ہماری مقبولیت کا گراف اوپر تھا۔

❖ آپ نے جیل کو موضوع نہیں کیا؟

● جیل جانے کا واقعہ کوئی اتنا بڑا کارنامہ نہیں تھا کہ ڈھول پیٹا جا سکتا۔ وہ ایک مشکل زمانہ تھا۔ بہت سے دوستوں نے جیلیں کاٹیں اور طویل مدت کی قید کاٹی۔ کئی صحافی دوستوں کو کوڑے بھی لگے۔ اس جنگ کا ایک بے نام سپاہی میں بھی تھا جو انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہو گیا تھا۔ میں نے جیل میں فراغت کا وقت کارآمد بنانے کی کوشش کی تھی اور سوچا تھا اس دوران ہنگری میں گزرے ہوئے دور کی کہانیاں لکھوں گا۔ سب کاغذات اور مواد ایک تھیلے میں تھے جسے جیل منگوایا لیکن وہ تھیلا مجھ تک نہیں پہنچ سکا۔ ان کاغذات میں پراودا کا وہ پہلا شمارہ بھی تھا جس پر لینن کے دستخط چھپے ہوئے تھے۔ یہ ہمیں ماسکو کے قیام کے دوران روسی صحافیوں کی انجمن نے تحفے میں دیا تھا۔ جیل کے سنسر نے اسے شاید دھماکہ خیز مواد سمجھ کر کسی کوڑا گھر میں پھینک دیا۔

❖ آپ کے بے باک قلم کے کچھ اور واقعات بتائیے؟

● بتانے کے لیے بہت وقت چاہیے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد حکمران فوجی جنرلوں اور فوجی قیادت کے خلاف بہت سی تفتیشی رپورٹیں لکھیں۔ ہندوستان کے اس وقت کے ایک معتبر انگریزی جریدے السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کے غالباً فروری ۱۹۷۲ء کے شمارے میں اس کے چار صفحات پر میری ان رپورٹوں کا عکس شائع ہوا۔ بدقسمتی سے

میرے پاس وہ شمارہ محفوظ نہیں ہے۔ ۱۹۷۷ء میں پاکستان میں فوجی حکومت آئی تو وہ بہت سخت گیر تھی۔ ہم نے اپنا تحریری جہاد رکھا۔ ایک ایک کر کے ہمارے مختلف رسالے بند کیے گئے۔ بہت سے مقدمات بنے۔ بے وطنی کی یہ مستقل صورت اسی دور کا عطیہ ہے۔

❖ پاکستان سے ہجرت کی وجوہات کیا تھیں؟

● حکومت نے جو مقدمات قائم کئے تھے ان کا الجھاؤ تھا۔ ہمارے اپنے اشاعتی ادارے کا کام تقریباً معطل تھا۔ معاش کے سب دروازے بند تھے۔ ذہنی دباؤ بھی رہا ہوگا۔ طبیعت اچاٹ ہوگئی تھی۔ بس اچانک فیصلہ کیا، ٹکٹ کٹایا اور چند روز بعد اپنا سامان لیے نیویارک ایئرپورٹ کے باہر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کہاں اور کیوں آ گیا ہوں۔ اب آپ اسے فرار کہہ لیجئے یا بزدلی۔ ایک بار وطن چھوڑ کر نکل پڑا تو پھر پوری دنیا بازو پھیلائے کھڑی تھی۔

❖ اردو زبان، عالمی درجہ بندی پر تیسرے مقام پر ہے، آپ نے اتنے سارے ممالک میں اس حقیقت کا مشاہدہ کیا ہوگا، آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

● غیر ممالک میں بسنے والے اردو خاندانوں میں اردو کی حیثیت بول چال کی گھریلو زبان کی ہے یہ کسی حد تک اس کی ثقافتی حیثیت ہے اور اس کی یہ حیثیت بھی وقت گزرنے کے ساتھ معدوم ہوتی جارہی ہیں۔ خود پاکستان میں جہاں اردو کی حیثیت قومی زبان کی ہے کچھ زیادہ اچھا حال نہیں ہے۔ ہم اس سلسلے میں جذباتی بحث کر سکتے ہیں، واویلا مچا سکتے ہیں جو ہم آج سے نہیں برسوں سے کررہے ہیں۔ شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر میں عبدالماجد دریا آبادی کے ۱۹۴۷ء کے لکھے گئے ایک خط کا عکس ہے جس میں اردو کی زبوں حالی کا رونا ہے۔ آپ نے اپنے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ تنزلی کا یہ سلسلہ پچاس سال گزرنے کے بعد بھی جاری ہے۔ تنزلی کا یہ عمل بتدریج ہے اور وجہ اس معاشرے کی تنزلی یا عدم ترقی ہے جس میں یہ زبان بولی جاتی ہے۔ زبانیں خلا میں پرواز نہیں کرتیں زمین پر رہتی ہیں۔ جس سماج میں وہ بولی جاتی ہیں وہ اگر ترقی کی دوڑ میں پیچھے ہے، اس کی معیشت کمزور ہے، سائنسی اور صنعتی طور پر پس ماندہ ہے تو پھر اس سماج کی زبان اور ثقافت بھی غریب رہے گی۔ اردو مستقبل نہیں بنا سکتی نہ روٹی دے سکتی ہے۔ انگریزی کی مثال لے لیجیے۔ آج کی دنیا میں انگریز کی انگریزی کم اور امریکہ کی انگریزی زیادہ رائج ہے جو تلفظ اور املے کے اعتبار سے کلاسیکی

انگریزی سے مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی رہنما طاقت انگلینڈ نہیں امریکہ ہے۔ آپ سے معذرت کے ساتھ، میں اردو کے کسی روشن مستقبل کی پیش گوئی نہیں کرسکتا اور نہ ہی ایسی کوئی امید رکھتا ہوں، باوجود اس کے کہ اردو سے میری جذباتی وابستگی بہت گہری ہے۔

❖ آپ کے تینوں، ناول پاکستانی حکومت سے انعام یافتہ ہیں، تو آپ نے ان انعامات کو کیوں کر قبول کیا، جب کہ آپ پاکستانی سیاست سے قطعی مطمئن نہیں اور آپ کی سوچ کینوس پر جو پاکستان مصور ہے وہ آپ کو ملا نہیں؟

● میرے تینوں نہیں، صرف ایک ناول 'بے وطن' کو اکادمی ادبیات پاکستان نے ۱۹۹۷ء کے بہترین ناول کا وزیر اعظم ادبی ایوارڈ دیا تھا۔ اس وقت پاکستان میں ایک منتخب جمہوری حکومت قائم تھی۔ میں نے پاکستان کی کسی حکومت یا اس کے ادارے سے اس ایوارڈ کے سوا کچھ نہیں لیا۔ میری سوچ کے کینوس پر جو پاکستان مصور ہے اس کا نقشہ صدر محترم میں دیکھا جاسکتا ہے۔

❖ اردو زبان میں خاصے عمدہ ناول لکھے گئے ہیں۔ اداس نسلیں، خدا کی بستی، تلاش بہاراں، آگ کا دریا، راجہ گدھ، ٹیڑھی لکیر، الکھ نرنجن، شکست، ایک چادر میلی سی اور کرشن چندر کے بہت سے ناول ان ناولوں میں آپ کے پسندیدہ ناول کون سے ہیں اور کیوں ہیں؟

● سب بہت عمدہ ناول ہیں۔ میرے پسندیدہ ہیں۔ ان میں آپ خدیجہ مستور کا ''آنگن'' بھی شامل کرسکتے ہیں۔ میری فہرست میں آگ کا دریا اور خدا کی بستی اوپر ہیں۔ کرشن چندر کے ناولوں سے زیادہ مجھے ان کے افسانے پسند ہیں۔

❖ پاکستان میں اب ناول کم لکھے جارہے ہیں اور انہیں وہ شہرت نہیں مل سکی جو اداس نسلیں، آگ کا دریا، خدا کی بستی اور راجہ گدھ کو حاصل ہوئی کیا خیال ہے؟

● شاید زمانوں کا بھی فرق ہے۔ آپ جن ناولوں کے نام لے رہے ہیں وہ اس زمانے میں لکھے گئے جب ذہنی تفریح کا ایک بڑا ذریعہ ناول اور کتابیں تھیں۔ انہیں پڑھا جاتا تھا، ان کا تذکرہ ہوتا تھا۔ ان پر گفتگو ہوتی تھی اور ایک اچھے ناول کی گونج دیر تک قائم رہتی تھی۔ اب تفریح کے ذرائع لامحدود ہیں اور ان میں ایک نئے ناول نگار کے لیے جگہ بنانا آسان نہیں

ہے۔ عبداللہ حسین نے ''اداس نسلیں'' کے بعد بھی بہت اچھے ناول لکھے لیکن ہم صرف ''اداس نسلیں'' پر آ کر رک جاتے ہیں۔ خدا کی بستی کو زیادہ شہرت اس وقت ملی جب اس پر ایک کامیاب ٹی وی سیریل بنی۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ناول لکھنے کے لیے یکسوئی اور فراغت ضروری ہے جو روٹی کمانے کی مشقت کے دوران مشکل سے ملتی ہے۔

❖ آپ کے تینوں ناولوں کو پاکستان کے فکشن نگاروں نے بے طرح پسند کیا، تاہم اردو عالم میں اتنی گونج نہیں سنا پائی کہ اردو عالم کے شہرت یافتہ ناولوں کے ساتھ انہیں رکھا جا سکے؟

● اردو عالم کے شہرت یافتہ ناولوں سے میرے شعور کی تربیت ہوئی ہے، میرے ناول ان کے شانہ بہ شانہ ہونے کے بارے میں نہیں سوچتے۔ میرے ناولوں کو جتنی شہرت ملی ہے وہ کافی ہے اور میں اس پر قانع ہوں۔

❖ اپنے تینوں ناولوں کے بنیادی کرداروں کا مختصراً تعارف کروایئے اور کچھ تخلیقی کلمے بھی لکھیے۔

● ہر ناول میں لاتعداد کردار ہیں ہر ایک میں کم از کم دس بارہ ایسے ہیں جو کہانی کی بنیادی اساس ہیں۔ بے وطن کا مرکزی کردار سلیم ہے جو انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آسٹریلیا آتا ہے اور پھر اصل مقصد سے بھٹک کر شادیوں کا جال بننے لگتا ہے۔ صدر محترم میں ساحل ہے جو نیویارک کی ایک یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہا ہے اور حالات ایک بڑی تباہی روکنے کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر رکھ دیتے ہیں۔ وزیر اعظم کا مرکزی کردار جلالی ہے، ایک صحافی جو اقتدار مافیا کا آلہ کار بن جاتا ہے۔

❖ اس وقت ہند و پاک میں جو ناول طبع ہو چکے ہیں، اگر آپ نے انہیں پڑھا ہے تو اپنے تاثرات لکھیے؟

● حال میں جو ناول شائع ہوئے ہیں مجھ تک نہیں پہنچے۔ کراچی جاتا ہوں تو اردو بازار کے کتاب گھر پرانے ناولوں کے نئے ایڈیشنوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ کسی نئے ناول تک رسائی آسان نہیں ہے۔

❖ اس وقت اردو زبان اردو کی نئی بستیوں میں فروغ پا رہی ہے، کیا یہ اطمینان بخش رفتار ہے؟

● یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اردو کی نئی بستیوں میں اردو فروغ پا رہی ہے۔ میرے خیال میں تو

معاملہ اس کے برعکس ہے۔ نئی بستیوں میں ہونے والے مشاعرے اردو کے فروغ کا مظہر قرار نہیں پا سکتے۔ اور اب ان میں بھی کمی آ رہی ہے جس کی ایک وجہ ویزا حاصل کرنے کی مشکلات بھی ہیں۔ خلیجی ممالک کا معاملہ یورپ، شمالی امریکہ اور آسٹریلیا سے مختلف ہے۔

❖ شاعری اور افسانے کی طرح، ناول سنانے کا رواج کیوں نہیں ہے؟ کچھ ابواب کی حد تک تو یہ ممکن ہو سکتا ہے؟

● میں نے آسٹریلیا میں ناولوں کے باب پڑھنے اور ان پر بحث کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ میرا خیال ہے اس سلسلے کو فروغ ملنا چاہیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ پڑھنے والے بہک جاتے ہیں اور طویل تحریریں پڑھتے ہیں جو بسا اوقات سننے والوں کی بے زاری کی وجہ بنی ہیں۔ مختصر تحریریں پڑھی جائیں تو سامعین کی توجہ قائم رہتی ہے۔ گذشتہ سال دبئی میں کہانی میلہ ہوا تھا جو بہت کامیاب رہا تھا۔

❖ ناول نگاری کے لیے کیا آپ ''ہوم ورک'' بھی کرتے ہیں؟ وہ کس طرح کا ہوتا ہے؟

● پہلے پلاٹ بُنتا ہوں، انجام طے کرتا ہوں، کردار منتخب کرتا ہوں۔ پھر ابواب کی تقسیم ہوتی ہے۔ یہ طے ہونا ہے کہ کون سا کردار کہاں آئے گا۔ نقشہ مکمل ہو جاتا ہے تو پھر عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

❖ ناول لکھنے کے دوران ''کوئی افسانہ'' کوئی شعر بھی ابھرا ہوگا تو کیا آپ نے انہیں ناول میں سمو دیا یا علیحدہ سے کہانی اور شاعری لکھی؟

● برسوں سے بہت سے افسانے ذہن میں تھے جن میں سے کئی ناولوں میں آ گئے۔ کرداروں کی ضرورت کے مطابق ان سے شعر اور نظمیں بھی پڑھوائیں جنہیں خاص طور پر ناولوں کے لیے ہی لکھا گیا تھا۔

❖ آپ خالص غزل کے شاعر ہیں یا نظم کو بھی اپنایا؟

● میری پسندیدہ صنف غزل ہے لیکن نظمیں بھی کہی ہیں۔ آزاد نظمیں زیادہ ہیں۔ عرب شاعر نزار قبانی نے عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست پر ایک طویل نظم لکھی تھی جو بہت مشہور ہوئی تھی۔ میں نے ''کتاب شکست میں لکھے گئے حاشیے'' کے عنوان سے نثری نظم کی صورت میں اس کا ترجمہ کیا ہے جو آمرے قریب آ میں شامل ہے۔ ''وسعت زنداں'' کے

نام سے ہنگری کے ایک مشہور شاعر جوزف اٹیلا کی ایک نظم کا بھی ترجمہ کیا۔

❖ غزل اور نظم میں آپ کا تخلیقی لوازمہ تغزل، سیاست، سماجی سروکار، یا پھر تصوف ہے؟

● تصوف تو بالکل نہیں ہے۔ تغزل زیادہ ہے۔ کچھ سیاسی اور سماجی معاملات بھی ہیں۔ ایک غزل کے دو شعر سن لیجیے۔

لکھی تھی جس میں داستاں اونچی اڑان کی
رکھا تھا اس کتاب میں اک پر لہو میں تر
امن و اماں کا حال میں کیا اس سے پوچھتا
رستے میں مل گیا تھا کبوتر لہو میں تر

❖ اگر آپ نے نظمیں بھی تخلیق کی ہیں تو بہت نمائندہ نظموں میں سے دو، تین سنائیے۔

● نظمیں کم کہیں ہیں، پابند کم اور آزاد نظمیں زیادہ۔ کچھ فکری اور کچھ واقعاتی نظمیں ہیں۔ پاکستان کے یوم آزادی پر آسٹریلیا میں ایک ایڈیٹر دوست نے فرمائش کی تو ایک نظم ''آزادی''، لکھی جو اخبار کے صفحہ اول پر شائع ہوئی۔ اس کا پہلا حصہ تھا:

بھائی مرے تم نے جو کہا ہے/ گیت لکھوں آزادی کا/ لیکن یہ بھی کہہ دیتے/ کون سی، کس کی/ کیا کرنے کی آزادی/ بھوکا رہنے، فاقہ کرنے/ گولی کھا کر مرنے کی/ یا/ غم کھانے، دکھ سہنے کی آزادی/

پاکستان اور بھارت کے ایٹمی دھماکوں پر ایک نظم ''خودکشی''، لکھی تھی۔ میں دہلی میں تھا تو زی ٹی وی نے ریکارڈ بھی کی تھی، یہ نہیں معلوم کہ چلی یا نہیں۔

❖ شعرائے آسٹریلیا، آپ کی تالیف ہے۔ آسٹریلیا اردو ادب کا رجحان تعارف مع اجمالاً پیش کیجیے۔

● اس وقت آسٹریلیا میں ادبی سرگرمیاں فروغ پا رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ شعر کہنے والوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی اور سب کے پاس اتنا ذخیرہ نہیں تھا کہ الگ الگ کتاب بن سکتی۔ اسی لیے اردو سوسائٹی آف آسٹریلیا کی طرف سے شاعر دوستوں کا منتخب کلام ان کے تعارف کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ اب تو آسٹریلیا میں بہت سے دوستوں کی شعری اور نثری کتابیں چھپ چکی ہیں۔

❖ خلیجی ممالک میں اردو زبان وادب، خاصہ فروغ پا رہا ہے، آپ اپنے تجربات و مشاہدات اور معتبر شعراء کے منتخب اشعار کے ساتھ شاعر کے عالمی قارئین سے متعارف کروائیے۔

● جی ہاں! خلیجی ممالک میں بہت کام ہو رہا ہے، خاص طور پر شاعری کے حوالے سے۔ امارات میں یعقوب تصور، ظہورالاسلام جاوید، مصدق لاکھانی، تسنیم عابدی، ڈاکٹر ثروت زہرہ، یعقوب عنقا، ڈاکٹر عاصم، صبیحہ صبا، فرزانہ سحاب مرزا اور کتنے ہی نام ہیں۔ افسانے کا یک بہت معتبر نام نجم الحسن رضوی تھے جو کوئی چالیس برس گزار کر واپس پاکستان چلے گئے اسی طرح شفیق سلیمی بھی واپس چلے گئے۔

اس سلسلے میں ان کا ایک بہت خوب صورت شعر ہے۔

بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے
اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے

نثر لکھنے والوں میں کبیر خان کا نام بہت نمایاں جو بہت کٹیلی اور توانا نثر لکھتے ہیں۔ ہجرت کے حوالے سے یہاں کے دوستوں نے بہت اچھے شعر کہے ہیں۔ ظہورالاسلام جاوید کا شعر ہے۔

ہمیں جو رزق دیا اس میں وسعتیں لکھ دیں
مگر حصول میں صحرا کی شدتیں لکھ دیں

اسی طرح یعقوب تصور کا یہ شعر بھی بہت مشہور ہوا۔

عمر ہماری صحراؤں میں ریت ہوئی
گھر والوں نے تاج محل تعمیر کیا

❖ کوئی ناول لکھ کر آپ اسے بار بار پڑھتے اور حذف و اضافہ کرتے ہیں یا کسی کو سنا کر مشورہ طلب کرتے ہیں؟

● ایڈیٹنگ میرا پیشہ ہے۔ اپنا ایڈیٹر بھی میں خود ہوں اور میری تحریریں میرے ہی ہاتھوں کڑی ایڈیٹنگ کے عمل سے گزرتی ہیں۔ بے وطن لکھی گئی تو بارہ سو صفحات تھے، ایڈیٹنگ کے بعد آٹھ سو صفحات کی رہ گئی۔

❖ ایک ناول کی تکمیل میں آپ کتنا وقت لیتے ہیں؟

- اس کا انحصار بہت سی باتوں پر ہے۔ بے وطن کو مکمل ہونے میں تین اور وزیراعظم کو دو سال لگے۔ صدر محترم نے چار سال کا وقت لیا۔ ''جج صاحب'' کا ابتدائی کام دو سال سے مکمل ہوا رکھا ہے لیکن ابھی لکھنا شروع نہیں کیا۔

❖ ایک تخلیق کار کے لیے مطالعہ از بس ضروری ہے اور اس کے لیے اس کا نجی کتب خانہ ناگزیر ہے جب کہ آپ ہجرتوں ہجرت مسافر ہوتے رہے، تب آپ نے مطلوبہ کتب کی فراہمی کے لیے کیا اقدامات کیے؟

- میں نے بہت ہجرتیں کیں لیکن میری کتابیں میرے ساتھ رہیں اور اب بھی ہیں، ان میں اضافے کی رفتار بھی وہی ہے۔ ان کی نقل و حرکت کے اضافی اخراجات بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔ ساتھ ہی لائبریریوں سے میری محبت بھی قائم ہے۔ میرے تینوں ناولوں کا بیشتر حصہ سڈنی کی لائبریریوں یا ان سے متصل کافی گھروں میں لکھا گیا ہے۔ صدر محترم کے کچھ باب نیو یارک کی اسٹیٹ پبلک لائبریری میں بیٹھ کر بھی لکھے تھے۔ آج کل انٹرنیٹ نے زندگی بہت آسان کر دی ہے۔ انگلیوں کی چند جنبشیں آپ پر علم کے خزانوں کا دروازہ کھول دیتی ہیں۔ امیزن ڈاٹ کام کے ذریعے کتابوں کی خریداری بھی آسان ہوگئی ہے۔ امارات میں مجھے لائبریری کا دل پسند ماحول نہیں ملا اسی لیے لکھنے کی رفتار بھی سست ہے۔

❖ بہ حیثیت مسافر کے آپ نے اپنی آنکھوں سے دنیا دیکھی اور بھوگی ہے۔ تو اس فانی دنیا کے بارے میں آپ کے ''خواب رنگ'' خیال کیا ہیں؟

- نوجوانی میں انقلاب کی جستجو تھی، پھر امن کی شدید خواہش دل میں آ بسی۔ بے وطن کا ایک تخیلاتی باب اسی خواہش کی تفسیر ہے۔ لیکن عمر جتنی بڑھتی جا رہی ہے اور دنیا جتنی ترقی کر رہی ہے اس کے ساتھ ہی امن کی خواہش ایک ڈراؤنا خواب بنتی جا رہی ہے۔ خاص طور پر ہمارے خطے میں۔

❖ ۵۹ سالہ ماہ و سال کا نچوڑ کیا ہے؟

- حب الوطنی کی نئی تعریف متعین کرنا ضروری ہے۔ وطن کا حُب ایک مثبت جذبہ تھا لیکن ہم نے اس سے نفرتیں اگائیں اور اسے جنگ و جدل اور خانہ جنگیوں کی وجہ بنایا۔ اسی طرح مذہبی منافرت اور شدت پسندی اور عدم رواداری انسانیت کے بڑے دشمن ہیں۔ ایک

اچھی دنیا تخلیق کرنے کے لیے ان برائیوں سے چھٹکارا ضروری ہے۔

❖ آپ پاکستانی اخبارات میں لکھتے رہے ہیں۔ آپ کے موضوعات کیا تھے؟ کیا ان مضامین کا کوئی انتخاب بھی شائع ہوا؟

● میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے صحافت میں داخل ہوا تھا۔ جس سے میری انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کی رفتار بہت تیز ہوگئی تھی۔ انگریزی کتابوں کا ترجمہ کیا جو سلسلہ وار شائع ہوئیں لیکن انہیں کتابی شکل میں نہیں چھاپا۔ بہت برسوں تک سیاسی تجزیوں پر مشتمل کالم بھی لکھے۔ وہ بھی کتابوں کی شکل اختیار کر سکتے تھے۔ معیار میں میرا کالم ''آف دی ریکارڈ'' بہت مقبول تھا، ان کا مجموعہ بھی کتاب بن سکتا تھا۔ میرے چھوٹے بھائی نے میرے انٹرویوز جمع کر کے انہیں کتابی شکل دی تھی اس میں جنرل ضیاء الحق اور بے نظیر بھٹو سمیت اہم شخصیات کے انٹرویو شامل تھے لیکن میں نے کتاب طبع نہیں ہونے دی شائع شدہ صحافتی تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کے بارے میں میرے کچھ تحفظات ہیں۔ صحافت آج کا قصہ ہے جو دن گزرنے کے بعد پرانا ہو جاتا ہے۔

❖ آپ نے آسٹریلیا ریڈیو پر بھی ملازمت کی اور اردو سروس کے سربراہ رہے تھے۔ کچھ اس ملازمت کے بارے میں بتایئے کہ کس نوعیت کے پروگرام ہوتے تھے؟ کیا اور لکھنے اور سننے والے اتنے مل جاتے تھے کہ یہ سروس فعال رہی؟ کیا ابھی ایس بی ایس اردو سروس جاری ہے؟

● اسپیشل براڈ کاسٹنگ سروس (ایس بی ایس) حکومتی ادارہ ہے جس کا ٹیلیویژن نیٹ ورک ہے اور ریڈیو بھی ہے جس پر ۶۴ زبانوں کے پروگرام نشر ہوتے ہیں جو پورے آسٹریلیا میں سنے جاتے ہیں۔ ان میں اردو بھی شامل ہے۔ ایس بی ایس کی اردو سروس آسٹریلیا میں مقبول ہے کیونکہ اپنے ملک کا احوال جاننے کا ایک بڑا ذریعہ ہے اور اس کی یہ نشریات آج بھی جاری ہیں ساتھ ہی اب تقریباً ہر اہم شہر سے بھی اردو کے مختلف پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ اردو کے آن لائن اخبار بھی ہیں، رسالے بھی نکلتے ہیں۔

❖ کسی بھی فن پارے کی تخلیق کے بعد، خالق کو جو گوناگوں مسرت حاصل ہوتی ہے، وہ ہر ایک کا جداگانہ احساس ہوتا ہے۔ کسی ناول کی تکمیل پر آپ کو بے طرح مسرت نے سرشار کیا

ہوگا، تب آپ نے کیا نیا کچھ محسوس کیا ہوگا؟

- تخلیق مکمل ہونے پر مسرت کا احساس فطری ہے۔ مجھے بھی خوشی ہوتی ہے اور اطمینان کا احساس بھی، لیکن پھر یہ بے چینی بھی ہونے لگتی ہے کہ ابھی کتنا کچھ کرنا باقی ہے۔

❖ ایک فن کار کے فلک بھر خواب کیا ہونے چاہئیں؟

- پیار سے بھرے محبتوں سے بھرپور۔

❖ ہندو پاک کے اردو ادب میں ''مستعار تھیوریز نے خاصی ادبی چہل پہل رکھی۔ آپ کس مغربی فکر یا نظریے کے تحت ادب تخلیق کرتے رہے ہیں؟

- اردو ادب کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ شاعری کا معاملہ الگ ہے لیکن ہم نے اپنا افسانہ، مختصر کہانی اور ناول، سب مغرب سے مستعار لیے ہیں جہاں ان سب اصناف کی روایت بہت قدیم اور بہت مستحکم تھی۔ اسی لیے ادب کی تھیوریز بھی مغرب سے آئیں اور تنقیدی اصطلاحات بھی۔ یورپی ادب کی تشکیل اس کے اپنے تاریخی تجربات کے زیر اثر ہورہی تھی۔ ۱۸ویں صدی کا فرانسیسی انقلاب، ۱۹ویں صدی کی چرچ سے بغاوت، بیسویں صدی کی عالمی جنگیں، یورپی تاریخ کے چند نمایاں موڑ تھے۔ ہمارا تاریخی تجربہ یورپ کے ان تجربات سے مختلف تھا۔ لیکن ہم نے اپنے ادب کی تعمیر پھر بھی ان کی ادبی روایتوں اور تنقیدی نظم کی بنیاد پر کی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب اردو ادب کی پرورش ہورہی تھی ہم ایک یورپی طاقت کے زیرنگیں تھے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں ہمارے یہاں ادب میں نظریے کی بحث ترقی پسند ادب کی تحریک کے نتیجے میں زیادہ شدومد سے کی گئی۔ اس وقت اشتراکی نظام کے تابع ایک نئی دنیا تشکیل پارہی تھی۔ نظریاتی تنازعات شدید تھے۔ اردو کے ادیبوں میں بھی یہ تقسیم واضح تھی۔ میں طالب علمی کے دور سے ایک نظریے پر یقین رکھتا ہوں اور اس حوالے سے خود کو ترقی پسند قبیلے کا فرد سمجھتا ہوں۔ اب وہ نظریاتی تصادم نہیں رہا لیکن میری ذہنی وابستگی آج بھی قائم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں فکری آزادی کا قائل ہوں اور خود کو اپنے نظریے میں جکڑ کر نہیں لکھتا۔

❖ کیا ادب کے لیے نظریہ ضروری ہے؟

- جی نہیں! میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ فرد کی فکری نمو کے لیے نظریاتی اساس ضروری ہے لیکن

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ادبی تخلیق کسی نظریاتی خانے میں قید کردی جائے۔ ہم جس نظریے پر یقین رکھتے ہیں وہ ہماری تحریروں میں منعکس ضرور ہوگا لیکن ادب ونظریے کا ایک دوسرے سے ون ٹو ون تعلق نہیں ہوتا۔ تعلق جوڑا جائے تو ادب پروپیگنڈہ بن جاتا ہے۔

❖ ہر تخلیق کار کا اپنا وژن ہوتا ہے اوراس کی بھی جمالیات ہوتی ہیں۔ آپ کا وژن اور اس کی جمالیات کیا ہیں؟

● آزاد خیالی، حسن پرستی، انسان دوستی۔

❖ کیا آپ کے کسی ناول پر ٹیلی اوپیرا یا فلم بنی ہے؟

● بے وطن پر ٹی وی سیریل بنانے کی شروع میں کئی کوششیں ہوئیں۔ ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی لیکن یہ ایک مہنگا منصوبہ تھا۔ بہت سالوں سے میں نے اس بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔

❖ معاصر اردو ناولوں پر ہندو پاک میں کن فکشن نگار نقادوں نے جم کر لکھا ہے؟

● میں اس بارے میں زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ میں تنقید کم پڑھتا ہوں۔ تخلیقی مواد کی پیچیدگیاں اپنے طور پر پرکھتا ہوں، نقادوں سے مدد نہیں مانگتا۔ میں ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے ناولوں پر کئے گئے کام سے واقف ہوں۔ اسی پر انہیں ڈاکٹریٹ بھی ملی تھی اور ایک ادبی اعزاز بھی۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے بیسویں صدی کے افسانوں کا ایک بہت جامع جائزہ لیا ہے۔ جو ایک ضخیم کتابی شکل میں شائع ہوا ہے۔ میں ان کے اس کام سے بہت متاثر ہوں۔

❖ آپ اپنے معاصر ناول نگاروں میں کن کو پسند کرتے ہیں اور کیوں ان کے ناولوں کے نام اور خصوصیات بیان کیجئے؟

● قرۃ العین حیدر کے علاوہ کس کا نام لوں؟ پسندیدہ ناولوں کی فہرست طویل ہے۔

❖ شاعری میں آپ کا استاد کون ہے۔

● نقاش کاظمی میرے کالج کے زمانے کے دوست ہیں۔ ہم دونوں بین الکلیاتی شعری مقابلوں میں ایک ٹیم کے طور پر اپنے کالج کی نمائندگی کرتے تھے۔ وہ آج پاکستان کے ممتاز شاعروں میں شامل ہیں۔ کالج کے زمانے سے اب تک میں ان ہی کو اپنا کلام دکھاتا ہوں۔ اب آپ اسے استاد شاگرد کا رشتہ سمجھ لیجئے یا دوستی کا۔

❖ کیا آپ اردو عروض بھی جانتے ہیں؟ تقطیع کے اصولوں سے واقف ہیں؟ آپ کی پسندیدہ بحریں کونسی ہیں؟

● میں اردو عروض سے مکمل واقفیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

❖ آپ پی ایچ ڈی کر رہے تھے، جو نامکمل رہی، آپ کا موضوع کیا تھا، کس یونیورسٹی سے کر رہے تھے۔ آپ کا رہنما کون تھا؟ اسے مکمل کیوں نہیں کیا؟

● میں نے سڈنی کی یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز سے اپنے تحقیقی کام پر ایم اے آنرز کی ڈگری لی تھی۔ یہ کام میں نے مغربی ذرائع ابلاغ میں تیسری دنیا کی جانبدارانہ رپورٹنگ پر کیا تھا۔ چین کو کیس اسٹڈی بنایا تھا۔ اسی کام کو پی ایچ ڈی کے لیے آگے بڑھایا لیکن فوکس پاکستان تھا۔ ڈاکٹر اینڈریو چن میرے سپروائزر تھے۔ تحقیق کا بیشتر کام مکمل ہو گیا تھا لیکن میرے سپروائزر ریٹائر ہو گئے، جو نیا سپروائزر ملا اس کی موضوع پر گرفت نہیں تھی اس لیے اس کے ساتھ کام کرنے میں مزا نہیں آیا۔ میں نے تحقیقی کام درمیان میں چھوڑ کر ساری توجہ ناول لکھنے پر لگا دی۔

❖ آپ نے صحافت میں انٹرنیشنل ڈپلومہ کہاں سے حاصل کیا؟ موضوع کیا تھا؟

● حکومت کے ایک اسکالرشپ پر۔ ہنگری کے ایک انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ترقی پذیر ملکوں کے صحافیوں کو حکومت کی معرفت دعوت دی جاتی تھی۔ پاکستان کو یہ دعوت پہلی بار ملی تھی۔ قرعۂ فال میرے اور انگریزی اخبار 'ڈان' کے ایک دوست کے نام نکلا تھا۔ ہم صرف ہنگری میں نہیں رہے بلکہ صحافی انجمنوں کی دعوت پر روس، جارجیا، چیکوسلوکیہ اور رومانیہ بھی گئے۔ یہ ایک دلچسپ تجربہ تھا جس کے بارے میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔

❖ ہنگری ایک کمیونسٹ ملک ہے، کچھ وہاں کے بارے میں بتائیے کہ اردو زبان وہاں کس قدر ہے؟

● کمیونزم اب کہاں، پہلے تھا۔ ہنگری بھی سوویت یونین کے زیرِ نگیں وارسا پیکٹ کا ایک ملک تھا۔ اب تو سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں پچھلے سال کچھ دنوں کے لیے بڈاپسٹ گیا تھا، بہت کچھ بدلا ہوا دیکھا۔ اب نہیں معلوم، لیکن اس زمانے کے ہنگری میں اردو کا کوئی وجود نہیں تھا۔

- ❖ عالمی سطح پر جو یونیورسٹیاں مختلف زبانوں میں درس و تدریس کے مراحل طے کر رہی ہیں تو آپ نے اردو کو کہاں کہاں پایا؟
- ● جن ملکوں میں رہا ہوں مثلاً امارات، کویت، بحرین، آسٹریلیا، میں نے وہاں کی کسی یونیورسٹی میں اردو شعبہ نہیں دیکھا۔ اگر ہے تو میرے علم میں نہیں ہے۔ میں امارات کی سب سے بڑی یونیورسٹی سے وابستہ ہوں، کم از کم یہاں نہیں ہے۔ آسٹریلیا کی سڈنی یونیورسٹی میں ایک زمانے میں اردو پڑھانے کے لیے کلاسیں ہوتی تھیں، وہ بھی نجی کوششوں سے، میرا خیال ہے وہ سلسلہ بھی چل نہیں پایا۔
- ❖ آپ کے مطالعے کی میز پر عموماً کس طرح کی کتابیں ہوتی ہیں؟ ان میں سے آپ کی پسند کی چند کتابوں کے نام اور وجوہ اختصار کے ساتھ بتایئے؟
- ● میز پر ڈھیر رہتا ہے۔ اکثر کتابیں حالاتِ حاضرہ سے متعلق ہوتی ہیں، مثلاً آج کل طارق علی کی نئی کتاب ''THE DUEL'' پڑھ رہا ہوں ساتھ ہی صادقین کی ایک نئی سوانح حیات جو ان کی نواسی نے لکھی ہے۔
- ❖ اردو میں ایک ناول ''جج'' اور انگریزی ناول لکھ رہے ہیں تو ان کی داستانیں کن سے مرتب کی ہیں؟
- ● نئے ناول کا ڈھانچہ تیار ہے۔ ایک ڈیڑھ سال پہلے فی جی بھی رہ کر آیا ہوں۔ بحرالکاہل کا جزائر پر مشتمل ایک ملک ہے جس کے پس منظر میں ''جج صاحب'' لکھی جانی ہے لیکن ابھی تک شروع نہیں کر سکا۔ انگریزی کتاب انٹرنیٹ پر ہونے والے اندیکھے عشق کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ کچھ کہانیاں مکمل ہیں کچھ نامکمل ہیں۔ یہ منصوبہ بھی فی الحال کولڈ اسٹوریج میں ہے۔
- ❖ ناول لکھنا آپ کے لیے ایسا ہی ہے گویا ایک غزل مکمل کر لی، کیا میرا ایسا سوچنا صحیح ہے؟
- ● غزل تو آپ بعد میں بھی گنگناتے رہتے ہیں۔ ناول مکمل ہوتا ہے تو لگتا ہے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ کچھ عرصے خالی الذہنی کی کیفیت رہتی ہے، لیکن ان کرداروں سے اچانک رشتہ توڑ لینا آسان نہیں ہوتا جن کے ساتھ آپ ایک عرصے سے رہتے رہے ہیں۔
- ❖ اردو اور انگریزی ناولوں کے بعد کیا لکھنے کا اردہ ہے؟

- لکھنے کو بہت کچھ ہے، لیکن یہی دونوں چیزیں مکمل ہو جائیں تو بڑی بات ہے۔ کچھ نامکمل تحقیقی کام بھی ہیں۔

❖ آپ نے افسانے بہت کم لکھے ہیں اور ابھی کوئی انتخاب بھی شائع نہیں ہوا، شاعر میں ایک کہانی 'آپ کہاں سے ہیں؟' شائع ہوئی تھی۔ آپ تواتر سے کیوں نہیں شائع ہوتے؟

- آج کل میں صرف افسانے ہی لکھ رہا ہوں اور اس سال میرے افسانوں کا مجموعہ ''پہلی لکیر'' شائع ہوجائے گا تو دوستوں کی یہ شکایت بھی شاید دور ہوجائے گی کہ میں نے افسانے کے تجربے سے گزرے بغیر ناول نگار کا چوغہ پہن لیا۔ میرا ایک سیاسی افسانہ ''چوتھا کھلاڑی'' حال ہی میں پاکستان کے ایک کثیرالاشاعت اخبار کے میگزین میں شائع ہوا ہے۔ ایک اور سیاسی افسانہ ''تاریخ کا سبق'' ابھی ابھی مکمل کیا ہے، غالباً وہ بھی اسی اخبار میں شائع ہوگا، اگر ہوسکا تو کیونکہ اس افسانے میں میں نے کچھ خطرناک حدوں کو چھوا ہے۔ ''پہلی لکیر'' کشمیر کی کنٹرول لائن کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ میرا خیال ہے یہ افسانہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کو ناراض کرے گا۔

❖ کہانیوں میں آپ کے موضوعات کیا ہوتے ہیں؟

- میری کہانیاں انسانی تعلقات اور معاشرے کے بہت سے گھمبیر مسائل پر مبنی ہیں۔ سیاسی مسائل بھی ان کا اہم حصہ ہیں۔ لاطینی امریکہ کا ادب اسی لیے زیادہ متحرک ہے کہ اس نے سیاسی معاملات کو ادب میں برتا ہے، ان سے بیگانگی اختیار نہیں کی۔ میری کہانیاں خواہ وہ افسانے ہوں یا ناول، وہ صرف میرے مشاہدات اور تجربات کی رپورٹنگ نہیں ہیں بلکہ میں نے اپنے مشاہدے سے نیا تجربہ بھی تخلیق کیا ہے۔

❖ اب تک آپ نے کتنی کہانیاں لکھ لی ہیں اور وہ کن کن ادبی رسائل میں شائع ہو چکی ہیں؟

- بہت سی لکھی ہوئی تھیں، کچھ حال ہی میں لکھی ہیں اور کچھ لکھے جانے کے مراحل میں ہیں۔ میرا کام ادبی رسائل میں کم شائع ہوا ہے۔ پوری زندگی لوگوں کو شائع کرنے میں گزری ہے اب باڑ کے دوسری طرف جانا عجیب لگتا ہے، لیکن میری یہ جھجک آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔

❖ آپ کی نصف بہتر کنیز فاطمہ شاد، ذہنی امراض کی محققہ ہیں انہوں نے دماغ کی پیچیدگیوں پر کوئی نیا تحقیقی کام کیا ہو تو بتائیے؟

- بہت سے نئے کام ہیں اور ان کی ریسرچ کے نتائج دنیا کے معتبر جرنلز میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ گوگلز (Googles) کے ریسرچ انجن میں ڈاکٹر کنیز فاطمہ شاد کا نام ڈال کر دیکھیں، ان کے تحقیقی کاموں کی ایک طویل فہرست آپ کے سامنے آجائے گی۔ حال ہی میں وہ اس تحقیق کا حصہ رہی ہیں جس کے ذریعے مرگی کا نیا علاج دریافت کیا گیا ہے۔ وہ ایک ایسے طبی آلے پر کام کر رہی ہیں جس کے ذریعے ایلزائمر کے مریضوں کی پہلے سے نشاندہی ممکن ہوگی۔ انہوں نے اپنی ایک نئی تحقیق سے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ ذہنی امراض کی جو دوائیں استعمال ہو رہی ہیں وہ مغربی ممالک کے مریضوں پر تجربے کر کے دریافت کی گئی ہیں جب کہ ہمارے خطے کے لوگوں کا جینیاتی (Genetic) پروفائل مغربی لوگوں سے مختلف ہے اس لیے یہ دوائیں ہمارے خطے کے مریضوں پر زیادہ مؤثر نہیں ہوتیں۔ انہوں نے اسکیزوفرنیا پر بھی بہت کام کیا ہے۔

❖ انسانی دماغ کو کمپیوٹر سے تشبیہ دی جاتی ہے جبکہ دماغ تو کمپیوٹر سے بھی زیادہ پیچیدہ، فعال اور فلک بھر ہمہ جہت ہے۔ آپ کی بیگم کیا کہتی ہیں؟

- ان کا خیال ہے کہ خالق اور تخلیق کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ کمپیوٹر دماغ کی ہزاروں ایجادوں میں ایک اور دماغ کے اربوں خلیوں میں سے ایک کا ہزارواں حصہ ہے۔

❖ کیا انہیں بھی ادب سے دلچسپی ہے؟ کیا وہ آپ کی تخلیقی صلاحیتوں سے مطمئن ہیں؟

- وہ افسانے لکھتی تھیں اور کبھی کبھی شاعری بھی کرتی تھیں۔ شعرائے آسٹریلیا میں ان کی نظمیں شامل ہیں۔ وہ اپنے پرانے افسانوں پر نظر ثانی کر کے انہیں کتابی شکل میں شائع کرنے کی تیاری کر رہی ہیں۔

❖ آپ کی نصف بہتر کو آپ کے ناولوں میں سے کونسا زیادہ پسند ہے اور کیوں؟

- بے وطن۔ شاید اس لیے کہ اس کی کہانیاں دلوں کو چھو لیتی ہیں۔

❖ کیا ڈاکٹر کنیز فاطمہ شاد، آپ کی شاعری پسند کرتی ہیں؟ ان کے پسندیدہ شعر سنائیے۔

- میری شاعری ان ہی کے نام ہے۔ شاعری کے دونوں مجموعے ان سے منسوب ہیں۔ آپ ان سے پوچھیے گا تو کہیں گی کہ انہیں میرا ہر شعر پسند ہے۔

❖ زندگی اور موت، ازل سچائیاں ہیں۔ موت کے بارے میں کبھی آپ نے سوچا ہے تو کیا

محسوس کیا؟

- خوف۔

❖ ہندو پاک کے اردو روزناموں کی صحافت کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

- زوال پذیر ہے۔اس نے نئے زمانوں اوران کے تقاضوں سے زیادہ کچھ نہیں سیکھا۔

❖ غیر ممالک کے انگریزی لاطینی فرنچ زبانوں کے اخبارات کے مقابلے میں اردو اخبارات کی صحافت کا معیار آپ کی نگاہ میں؟

- صفر۔

❖ کیا آپ کے بچوں نے اردو پڑھی ہے؟ کیا انہیں بھی شاعری کا شوق ہے؟

- میرے تینوں بچے اردو بولتے ہیں۔ بیٹی پڑھ بھی سکتی ہے۔ ثمن اسکول اور یونیورسٹی کے زمانے میں انگریزی زبان میں شاعری بھی کرتی تھی۔ جو شائع بھی ہوئی ہے۔ میرا بڑا بیٹا ارسلان انگریزی گانے لکھتا ہے۔ وہ جس گروپ کا حصہ ہے ان کا ایک سی ڈی بھی ریلیز ہو چکا ہے۔ میرے چھوٹے بیٹے سلمان نے تھیٹر کی ڈگری لی ہے۔ اور سڈنی میں کئی اسٹیج ڈراموں میں مرکزی کردار ادا کر چکا ہے۔ ثمن لندن میں رہتی ہیں۔ وہ کل وقتی رائٹر ہیں ان کے کئی ڈرامے لندن میں اور ایڈنبرا میں اسٹیج ہو چکے ہیں۔ وہ بی بی سی کی طویل زمانے سے چلنے والی ریڈیو سیریل ''سلوراسٹریٹ'' کے لیے باقاعدگی سے لکھتی ہیں۔ ۲۰۰۹ء کے لندن میں ہونے والے مسلم ادیبوں کے ایوارڈ کے لیے ثمن کا ناول '' THE VIEW FROM ABOVE '' غیر شائع شدہ ناولوں کی کیٹگری میں نامزد بھی ہوا تھا۔

❖ پاکستان میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟ جبکہ وہاں پنجابی، سرائیکی، سندھی، ہندکو، براہوی زبانیں بھی ہیں اوران سب پر مستزاد انگریزی بھی۔ سرائیکی ایک بڑی زبان ہے۔ان کے بولنے والوں کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کی قومی زبان سرائیکی ہونا چاہیے۔ وہاں صوبوں اور زبانوں کے آپسی جھگڑوں میں اردو زبان بے طرح پھنسی ہوئی مرکزی حیثیت کی حامل ہے؟

- انگریزی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ سرائیکی بہت اچھی اور میٹھی زبان ہے، جہاں تک سرائیکی زبان کے قومی زبان بننے کا دعویٰ ہے، وہ مبالغہ آمیز ہے۔ پاکستان کی علاقائی

زبانوں کی اپنی ایک علیحدہ شناخت اوران کی اپنی تاریخ اور ثقافت ہے۔ اردو پاکستان کے کسی علاقے کی زبان تو نہیں ہے لیکن قومی زبان کی حیثیت سے رابطے کی زبان ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی قومی حیثیت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

❖ ہندو پاک کے ادبی رسائل کے معیار آپ کی نگاہ میں؟ کونسے ادبی رسائل آپ کو پسند ہیں اور کیوں؟

● میرے پاس شاعر کے علاوہ دوسرے ادبی رسائل نہیں پہنچتے۔ ایک زمانے میں پاکستان سے فنون اور افکار آتے تھے لیکن قاسمی صاحب اور صہبا لکھنوی کے انتقال کے بعد جاری نہ رہ سکے۔ منصورہ احمد نے جو نیا رسالہ نکالا اس کا صرف ایک شمارہ مل سکا۔ میرا خیال ہے شاعر کو اس اعتبار سے بھی امتیاز حاصل ہے کہ وہ ہر ماہ پابندی سے شائع ہونے والا ادبی رسالہ ہے۔ میں کئی دہائیوں سے اشاعتی کاروبار سے منسلک ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ کوئی بھی جریدہ خواہ ہفت روزہ ہو، ماہنامہ یا سہ ماہی، اس کی سب سے پہلی صفت یہ ہے کہ وہ وقت پر شائع ہوتا ہے۔

❖ اگر آپ کو شاعر مرتب کرنے کے لیے دیا جائے تو ۶۴ صفحات میں آپ کی ترتیب کیا ہوگی؟

● آپ شرمندہ نہ کریں۔ میں نے بہت سے اخباروں اور رسالوں کی ادارت کی ہے لیکن کبھی کسی ادبی رسالے کی نہیں۔ آپ جس طرح رسالہ مرتب کر رہے ہیں وہ مناسب ہے۔

❖ ہر ذی روح کو ایک بار زندگی ملتی ہے وہ جیتا ہے اور جلد اس فانی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اسلام میں موت کے بعد زندگی، قیامت میں دی جائے گی اور برزخ یا دوزخ میں اعمال لے جائیں گے۔ آپ کو اگر دوسری زندگی دی جائے تو آپ کیا بننا پسند کریں گے؟

● پتا نہیں۔ شاید کسی غریب ملک کا ایسا صدر بننا چاہوں جو امن اور مساوات قائم کر سکے۔

❖ کیا وجہ ہے کہ سوچنے والا ذہن وہ اگر قلم کار بالخصوص شاعر بھی ہو تو منشیات کا عادی ہو جاتا ہے۔ ہلکے سے ہلکا نشہ بیڑی ہے کیا آپ بھی کسی ہلکے سے ہلکے نشے کو اپنائے ہوئے ہیں؟

● کیا آپ مجھ سے میرا اعترافی بیان لینا چاہتے ہیں؟

❖ ام الخبائث، بیشتر اردو قلم کاروں کی محبوبہ ہے کہ اس کے بغیر یہ لوگ رہ ہی نہیں سکتے اور اپنی شام اس کے ساتھ عیاشی میں گزارتے ہیں کیا خیال ہے آپ کا؟

- فن کار عموماً کسی نہ کسی بے راہ روی کا شکار ہوتا ہے۔اس کے دماغ کی کوئی رگ ٹیڑھی ضرور ہوتی ہے۔تخلیق کا کام نو بجے سے پانچ بجے تک کی نوکری نہیں۔خبائث میں وہ بھی مبتلا ہیں جن کی محبوبہ ام الخبائث نہیں ہے۔اس لیے شراب کو برائی کی ماں قرار دینا زیادتی ہے۔

❖ آپ کے پسندیدہ پوشاک،غذائیں،موسم اور رنگ کونسے ہیں؟

- میں دفتری اوقات میں سوٹ اور بعد میں جینز پہنتا ہوں۔موسموں کے کتنے ہی رنگ دیکھے ہیں۔شدید سردی اور شدید گرمی۔آج کل جہاں رہتا ہوں۔وہاں بہار کے موسم کا پتا نہیں چلتا۔

❖ آپ کی پسندیدہ فلمیں کونسی ہیں اور کیوں ہیں؟

- ہندوستانی فلموں میں مظفر علی کی امراؤ جان ادا، پاکیزہ، دلیپ کمار کی دیوداس، نئی فلموں میں سودیش، کئی اور ہیں لیکن نام یاد نہیں آرہے۔انگریزی فلموں کی فہرست الگ ہے۔

❖ پسندیدہ غزلیں، گلوکار، گانے، اداکار، اداکارائیں، گیت کار، موسیقار، ہدایت کار کونسے ہیں؟

- فریدہ خانم سب سے پسندیدہ گلوکارہ ہیں۔

❖ کیا آپ عشق رنگ ہیں؟

- انتہائی!

❖ اردو کے نووارد فکشن نگاروں کے لیے آپ کا پیغام کیا ہے؟

- میں کسی طرح کا پیغام بر نہیں ہوں۔نہ پیغام دینے کا اہل۔میں صرف مکالمہ کر سکتا ہوں۔

(جون ۲۰۰۹ء)

ہمارے دانشوروں کا کردار مایوس کن رہا ہے

● آپ کی پہلی شناخت شاعری تھی پھر اچانک ناول نگاری کی طرف کیسے متوجہ ہو گئے؟

☆ یہ کام اچانک نہیں ہوا۔ ناول نگاری کی طرف رجحان تو پہلے بھی تھا، لیکن اس کے بارے میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھا۔ شاعری یقیناً اظہار کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ طالب علمی کے دور میں شاعری کی لیکن فوراً ہی صحافت سے وابستہ ہو گیا۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ صحافت کے طویل دور میں شاعری شاید کہیں کھو گئی۔ میں بنیادی طور پر صحافی تھا اور اب بھی ہوں۔ یہ 30 سال سے زیادہ مدت کی وابستگی ہے۔ اس عرصے میں بے شمار کہانیاں ذہن کے کمپیوٹر میں محفوظ ہو گئیں، بعض کہانیاں خبریں بن گئیں، بعض کا پس منظر کہانی بن گیا، یہی سب چیزیں ناول نگاری پر اُکساتی رہیں۔ یہ وہ ضمنی مواد تھا جو برسوں کے مشاہدے کا ثمر تھا۔ قریبی دوستوں نے جو اس سرمائے سے آگاہ تھے، مجھے ناول نگاری کی ترغیب دی اور میں نے ناول لکھنا شروع کر دیے۔

● آپ کا پہلا ناول ''بے وطن'' دیارِ غیر میں دکھ اٹھانے والوں کے بارے میں ہے جبکہ دوسرے ناول ''وزیراعظم'' کا موضوع سیاسی ہے، اس قدر مختلف موضوع خاصی تعجب کی بات ہے؟

☆ میرا خیال ہے موضوع مختلف ہونا تعجب کی بات نہیں ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ موضوع ایسا ہو جو زندگی کی حقیقتوں کی ترجمانی کرتا ہو۔ آپ کو یہ جان کر شاید تعجب ہو کہ ''بے وطن'' کی اشاعت سے قبل ہی دوسرے ناول ''وزیراعظم'' کا مسودہ تیار تھا۔ اس کا سبب وہی ہے جو میں نے ابھی بتایا کہ صحافت کے طویل دور میں بہت سا مواد ذہن کے کمپیوٹر میں محفوظ ہو گیا جو سیاسی راہداریوں، محلات کی غلام گردشوں اور اقتدار کے ایوانوں کی سازشوں سے متعلق تھا۔

- اس تیز رفتار زمانے میں جبکہ لوگوں کے پاس وقت کی کمی ہے، ناول لکھنا مناسب ہے؟

☆ ضخامت کے حوالے سے بعض سینئر دوستوں اور ناول نگاروں نے مجھ سے کہا کہ آئندہ مختصر ناول لکھوں لیکن میرا تجربہ اس کے برعکس ہے۔ اصل بات دلچسپی کی ہے۔ اگر کرداروں میں جان ہو اور مصنف نے محنت کی ہو تو ناول کی زندگی بہت طویل ہوتی ہے۔ اچھے ناول کو لوگ پچاس سال بعد بھی نہیں بھولتے۔ ضخامت ناول کا فنی تقاضہ ہے۔ میرا ناول ''بے وطن'' خاصا ضخیم ہے لیکن اسے ہر طبقے کے لوگوں نے پڑھا۔ اردو ڈائجسٹ نے ''بے وطن'' کو قسط وار شائع کیا، میرے مرحوم دوست احمد شمسی نے ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے کسی شرمندگی کا اظہار تک نہیں کیا بلکہ بلا اجازت اسے چھاپتے رہے۔ ایک اور جریدے نے بھی ایسا ہی کیا۔ بے وطن میں درجنوں کہانیاں سمائی ہوئی ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ ان کہانیوں کو لے کر کوئی صاحب ٹی وی سیریل نہ بنا ڈالیں۔

- کچھ سیاسی لوگ آپ سے بدظن بھی ہوئے ہوں گے بعض وہ جن کو ناول ''وزیر اعظم'' میں اپنا عکس نظر آیا ہوگا؟

☆ سیاسی رہنماؤں کی خوشنودی یا ناخوشی میرا مسئلہ نہیں ہے، یہ ناول عوام کے لیے ہے۔ اہلِ علم اور اہلِ نظر کے لیے ہے۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ کسی کے ذاتی معاملات یا عادات کو نہ چھیڑوں۔ میں تاریخ میں اپنا نام بددیانت ناول نگار کے طور پر لکھوانا نہیں چاہتا۔ میرا رشتہ یہاں کے لوگوں سے ہے جو سیاستدانوں کی ہوس اقتدار، منافقت، بدعنوانی اور کوتاہ ذہنی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ سیاستدانوں یا حکمرانوں سے نہ میرا کوئی رشتہ ہے اور نہ میں اس کا پابند ہوں۔

- ''بے وطن'' اگر انگریزی میں لکھا جاتا تو دیگر ملکوں کے لوگوں کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوتا، یعنی جن ملکوں کے تارکین وطن کے حالات پاکستانی تارکین وطن جیسے ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟

☆ مجھے خوشی ہے کہ دیگر زبانوں میں ''بے وطن'' کے ترجمے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس کا ہندی ایڈیشن تو شائع بھی ہو چکا ہے، گزشتہ سال دہلی میں اس کی رونمائی ہوئی تھی اس موقع پر ایک بڑی تقریب بھی ہوئی پورے بھارت میں اس کی خاصی شہرت ہوئی۔ ڈاکٹر نامور سنگھ نے کہا

کہ ہندی ادب میں بے وطنی پر ابھی تک نہیں لکھا گیا، ان کی بندہ نوازی ہے کہ انہوں نے ''بے وطن'' کے ہندی ایڈیشن کو ہندی ادب میں اہم اضافہ قرار دیا۔

● وزیراعظم خالصتاً سیاسی موضوع پر ہے۔ آپ نے اس میں بہت سے اہم سوالات اٹھائے ہیں کئی سوالوں کا جواب بھی دیا ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ناول لکھنے کے بجائے ایک مضبوط تجزیہ ملک کے سیاسی رہنماؤں پر لکھتے اس طرح پذیرائی بھی زیادہ ہوتی؟

☆ جہاں تک پذیرائی کا سوال ہے تو مجھے خوشی ہے کہ دونوں ناولوں کی پذیرائی میری توقع سے زیادہ ہوئی۔ رہی بات تجزیہ لکھنے کی تو جناب برسوں تک جب میں یہاں تھا اخبارات میں سیاسی تجزیئے لکھتا رہا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ سیاستدانوں کا سنجیدگی سے تجزیہ کرنا لاحاصل ہے۔ ہمارے ملک میں سیاست سائنسی بنیادوں پر نہیں ہوتی جبکہ ہر تجزیے کی بنیاد سائنس ہوتی ہے۔ تجزیہ آپریشن کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے لیے ایک زندہ وجود ضروری ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ میں پوسٹ مارٹم کروں اور اسے آپریشن قرار دوں۔ بعض مہربانوں نے مجھے کہا کہ وہ افراد میرے قلم کا ہدف بنے ہیں جو اقتدار کی طلب میں مبتلا ہیں۔ میں اپنے اس جرم کا اقرار کرتا ہوں۔

● یہ سب کردار طبقہ امراء کے ہیں، ایسا کیوں ہے؟

☆ ایسا اس لیے ہے کہ ہمارے سیاستدانوں کی غالب اکثریت کا تعلق جاگیرداری یا سرمایہ داری سے ہے۔ کراچی یونیورسٹی ٹیچرز سوسائٹی نے مجھے بلایا تھا۔ اس تقریب میں پروفیسروں نے بہت اچھی باتیں کیں۔ طالب علم بھی شریک تھے۔ ایک صاحب نے بہت اچھا سوال پوچھا کہ میں غریبوں پر کیوں نہیں لکھتا۔ میں ان کے بارے میں لکھتا ہوں جنہوں نے اس ملک پر غربت مسلط کی ہے جو عوام پر اس اندھیرے کو بدستور طاری کرنے کے لیے دن رات سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ خود آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہی کیوں نہ ہوں، جب بھی انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ ملک کے غریب بیدار ہو جائیں گے تو یہ فوراً متحد ہو جاتے ہیں۔ ایک جان دو قالب ہو جاتے ہیں، کبھی جمہوریت کے نام پر اور کبھی کسی اور دلکش نعرے پر۔

● آپ سیاستدانوں سے اس قدر ناراض ہیں، ہمارے ملک پر 23 سال فوج کی حکومت رہی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں فوج کے لیے خاصا نرم گوشہ ہے؟

☆ خاصا بے رحمانہ اور اذیت ناک سوال ہے۔ دیکھیے طالب علمی کے دور سے اب تک میری پوری زندگی لوگوں کے سامنے ہے۔ میرا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے 4 مارشل لاء نہ صرف دیکھے بلکہ اپنی بساط کے مطابق ان کا مقابلہ بھی کیا۔ حتیٰ المقدور قربانیاں دیں لیکن کبھی ان سے مفاہمت نہیں کی۔ اس معاملے پر میں زیادہ نہیں کہوں گا۔ میرا موضوع میری اپنی ذات کبھی نہیں رہی۔

- لیکن ''وزیر اعظم'' میں صرف سیاستدانوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے، دوسروں کا نہیں؟

☆ جی ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اس لیے کہ میرا موضوع سیاستدان ہیں۔ ساری خرابیوں کا اصل سبب ملک میں جاگیرداری کا غلبہ ہے۔ اگر کوئی نمایاں مقام حاصل کر لے تو وہ بھی اسی نظام کا تحفظ کرتا ہے۔ ہمارے سامنے ایوب خان، چوہدری محمد علی، ملک غلام محمد اور ایسی کئی مثالیں ہیں۔ یہ جاگیردار نہیں تھے لیکن انہوں نے جاگیرداری کو تحفظ فراہم کیا۔ پہلے وہ جو بھی رہے ہوں لیکن سیاستدان بن گئے تھے اور اس حیثیت میں اپنا کردار ادا کیا۔ آپ اس بات کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں کہ پاکستان کے عوام نے 12 اکتوبر کے فوجی اقدام پر کسی مخالفانہ ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ کیا یہ سیاستدانوں کے خلاف اظہار عدم اعتماد نہیں ہے۔

- عوام غلط فیصلہ بھی تو کر سکتے ہیں؟

☆ جی نہیں۔ میں نہیں مانتا کہ عوام جاہل ہیں یا انہوں نے کوئی غلطی کی۔ انہیں جب بھی موقع دیا گیا انہوں نے حالات کی تبدیلی کے لیے ووٹ دیا۔ یہ سیاستدانوں کی شعبدہ بازی ہے کہ انہوں نے اسے شخصیت کے لیے ووٹ قرار دیا۔ ہمارے عوام کسی فرد کے پجاری نہیں ہیں۔ وہ اپنے بہتر مستقبل کے متلاشی ہیں۔ یہ ان کا بنیادی حق ہے۔ ہر مرتبہ اسی بنیاد پر انہوں نے ووٹ دیا اور ہر بار ان کے اعتماد کا خون کیا گیا۔

- ذوالفقار علی بھٹو کا انتخاب تو ثابت کرتا ہے کہ عوام نے ایک فرد کو اپنا ہیرو تسلیم کیا تھا؟

☆ نہیں جناب۔ عوام نے بھٹو کو بطور ایک فرد نہیں بلکہ نظام کی تبدیلی کے علم بردار کے طور پر قبول کیا تھا۔ یہی بھٹو جب تک ایوب خان کے دست راست تھے تو انہیں پسند کرنا تو درکنار عوام نے انہیں توجہ کا مستحق تک نہیں سمجھا لیکن یہی ذوالفقار علی بھٹو جب فرسودہ جاگیرداری، سرمایہ داری، نوکر شاہی کو بے خوفی کے ساتھ للکارتا ہوا میدان میں آیا تو نظام کی تبدیلی کی آرزو کو

سینوں میں چھپائے ہوئے کروڑوں عوام نے ان کا ساتھ دیا۔ خاص طور پر پنجاب کی مڈل کلاس نے ملکی تاریخ میں پہلی بار سرگرم اور فیصلہ کن سیاسی کردار ادا کیا۔

● لیکن بھٹو صاحب نے نظام کو تبدیل نہیں کیا؟

☆ میں مانتا ہوں لیکن یہ بھٹو صاحب کی غلطی تھی، عوام کا قصور نہیں تھا، میرا خیال ہے کہ یہی بھٹو کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ انہوں نے عوام سے کئے گئے عہد کو نباہنے کے بجائے اقتدار کو بچانے کے لیے استحصالی طاقتوں سے سمجھوتہ کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ میرے خیال سے اس ملک میں بنیاد پرستی کی ابتدا بھی بھٹو نے کی۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ مذہبی جماعتوں کا اثر زائل کر سکیں گے حالانکہ ان طاقتوں پر وہ 1970ء میں عوام کی مدد سے فتح پا چکے تھے۔ سوشلزم سے اسلامی سوشلزم، پھر مساوات محمدی کے نعرے اس کا ناقابل تردید ثبوت ہیں، یہ بھٹو صاحب کا المیہ ہے کہ وہ اپنی پچ پر کھیلنے کے بجائے مخالفین کی پچ پر کھیلنے چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب پی این اے کی ٹیم بنی اور اس نے باؤلنگ شروع کی تو بھٹو پہلے ہی اوور میں ''کلین بولڈ'' ہو گئے۔

● لیکن عوام نے ضیاء الحق کا بھی خیر مقدم نہیں کیا؟

☆ اس لیے کہ وہ فرسودہ نظام کے داعی تھے اور یہ بات سب پر پہلے ہی روز ظاہر ہو گئی تھی۔ ضیاء کے 11 سال بعد عوام نے بے نظیر کو منتخب کیا، صرف اس لیے کہ وہ تبدیلی چاہتے تھے۔ بے نظیر نے مایوس کیا تو انہوں نے آخری امید کے طور پر نواز شریف کا انتخاب کیا، لیکن جب دونوں اصل میں ایک ہی نکلے اور ان کے درمیان اقتدار کے لیے ''میوزیکل چیئر'' کا کھیل شروع ہو گیا تو عوام لاتعلق ہو گئے۔

● ملک کے دانشوروں کے کردار کے بارے میں آپ کیا رائے ہے؟

☆ یہ ایک المیہ ہے کہ ہمارے دانشوروں کا کردار بہت مایوس کن رہا ہے۔ دانشور اس ملک کے لیے کوئی نظریاتی بنیاد تشکیل نہ دے سکے اور فکری رہنمائی میں بری طرح ناکام ہو گئے۔ انہوں نے اپنی ذات کے فروغ کے لیے قوم کو فکری اور روحانی طور پر کھوکھلا کر دیا۔ قیام پاکستان کے بعد دانشوروں کا فرض تھا کہ وہ زمینی حقائق کا از سرِ نو تجزیہ کرتے، حالات میں اتنی بڑی تبدیلی کے بعد جو صورتحال تھی اس پر غور و فکر کر کے قوم کو نئی راہ عمل دیتے۔ دانشوروں کا راستہ

سیاستدانوں سے جدا ہے اور ان کا فرض بھی نسبتاً زیادہ اہم ہے لیکن دانشوروں نے ملک میں ایک روشن خیال جمہوری اور ترقی یافتہ معاشرے کی تشکیل کے لیے اپنا کردار انجام نہیں دیا۔ اس کے اثرات ہماری سماجی اور سیاسی زندگی سمیت ہر شعبے پر انتہائی ہولناک مرتب ہوئے ہیں۔ معاشرے میں آج جو معیارِ زندگی مصنوعی طور پر بلند کرنے کی دوڑ، عدمِ تحمل، کلاشنکوف کلچر، مہندی اور بسنت کی تقریبات، ذاتی اور اجتماعی زندگی کے ہر معاملے میں ابہام، بدفکری اور تہذیبی انحطاط ہے یہ سب بڑی خرابیاں ہیں جن کے پھیلاؤ کا ایک سبب دانشوروں کی تن آسانی اخلاص کی کمی اور غفلت بھی ہے۔

- آج کل ملک میں یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ پاکستان کی تشکیل صحیح تھی یا غلط، آپ کی کیا رائے ہے؟

☆ دیکھئے یہ فیصلہ کرنا کہ اب سے 53 سال پہلے جو واقعہ ہوا وہ صحیح تھا یا غلط سیاستدانوں کا نہیں تاریخ دانوں کا کام ہے۔ اُس وقت کس رہنما نے کیا کردار ادا کیا یہ فیصلہ بھی تاریخ ہی کرے گی، میری دانست میں یہ ایک غیر متعلق بحث ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ پاکستان اسٹیبلشمنٹ نے نہیں کروڑوں عوام نے بنایا تھا۔ اس کے لیے لاکھوں انسانی جانوں کی قربانی دی گئی تھی۔ اب پاکستان ایک تاریخی، جغرافیائی اور سیاسی حقیقت بن چکا ہے۔ اس وقت جس سوال پر غور ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ یہاں جو خرابیاں ہیں انہیں کیسے دور کیا جائے، اس کے لیے ماضی میں بھٹکنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

- مختلف قومیتوں اور لسانی اکائیوں کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟

☆ یہ مسئلہ ہمارے ملک میں صرف اس لیے سنگین ہوگیا کہ ہم نے لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا، ہر جائز بات پر بھی تنگ نظری کا مظاہرہ کیا گیا، ہر قومیت اور تہذیبی ولسانی اکائی کا حق ہے کہ اس کی جداگانہ شناخت کو تسلیم کیا جائے، تعجب تو اس بات پر ہے کہ یہاں قبائلی شناخت پر کوئی اعتراض نہیں کرتا لیکن تہذیبی اور ثقافتی شناخت کے سوال پر پاکستان کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ ایک منفی رویہ ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ لوگوں کی شناخت تسلیم کرنے، ان کے حقوق دینے اور ان کی عزت کرنے سے نہیں بلکہ حقوق سے محروم کرنے اور بے عزت کرنے سے پاکستان مسائل کا شکار ہوگا۔ مجھے تو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ذرا سی بات پر

پاکستان خطرے میں ہے کا واویلا شروع ہو جاتا ہے، اگر واقعی محض ایک نعرہ لگانے سے پاکستان کے ٹوٹ جانے کا ڈر ہے تو ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہمارا ملک اتنا نازک کیوں ہے؟

- آپ کی بات بہت اچھی ہے لیکن قیام پاکستان کے حوالے سے ماضی کے بارے میں بات تو کی جاسکتی ہے، ماضی ہی سے حال وجود میں آیا ہے؟

☆ 53 سال پرانا ماضی اچھا تھا یا برا، اب وہ آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یوں بھی ماضی صرف سبق سیکھنے کے لیے ہوتا ہے اس لیے نہیں کہ ماضی کی دھول اڑا کر مستقبل کا سفر ناممکن بنا دیا جائے، میری بات ازراہ کرم غور سے سنیے۔ آنے والے کل کا جو سورج ہے وہ گزرے ہوئے کل کے اُفق سے طلوع نہیں ہوگا۔ آنے والے کل کو اگر آج سے بہتر بنانا ہے تو اس وقت جو خرابیاں ہیں، انہیں کھلے دل سے تسلیم کرنا ہوگا اور مل جل کر ان سے نجات کی تدبیر کرنی ہوگی لہٰذا ماضی کا تجزیہ تاریخ دانوں پر چھوڑیے اور عوام کے لیے آنے والی نسلوں کے کل کی تعمیر کی فکر کیجیے۔

- فن ناول نگاری میں آپ کس سے متاثر ہوئے؟

☆ میں تمام اچھے ناول نگاروں کا احترام کرتا ہوں لیکن پیروی کسی کی نہیں کی۔ یہاں تک کہ خود ناول لکھنا شروع کیا تو دوسروں کے ناول پڑھنا محض اس لیے چھوڑ دیے کہ کہیں نادانستگی میں بھی تقلید کی چھاپ نہ لگ جائے، یہ ناول جیسے بھی ہیں میرے ہیں۔

- صحافت سے آپ طالب علمی کے زمانے ہی سے وابستہ ہو گئے تھے تقریباً 30 سال اس شعبے میں گزارنے کے بعد ملکی صحافت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

☆ میرا دوٹوک جواب ہے کہ صحافت نے کوئی ترقی نہیں کی۔ ہمارے ملک میں البتہ اخباری مالکان نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی، صحافی اپنی تمام تر صلاحیتوں اور محنت کے باوجود غریب تر ہو گئے۔

- گھریلو اور معاشی ذمہ داریوں کے ساتھ آپ ناول لکھتے ہیں، شاعری کرتے ہیں، کیا گھریلو ذمہ داریاں ان کاموں میں رکاوٹ نہیں بنتیں؟

☆ جی نہیں۔ میں اس معاملے میں بہت خوش قسمت ہوں۔ اس میں سب سے زیادہ حصہ میری بیوی ڈاکٹر یاسمین شاد کا ہے۔ انہوں نے مجھے روزمرہ کے ان کاموں سے استثنیٰ دے رکھا ہے، حالانکہ وہ خود بھی بہت مصروف رہتی ہیں، انہوں نے نیورو فزیالوجی میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔

وہ انسانی دماغ پر ریسرچ کرتی ہیں۔ آسٹریلیا کے علاوہ دیگر ترقی یافتہ ملکوں میں ان کی تحقیقی کاوشوں کو بڑے پیانے پر سراہا جاتا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود انہوں نے ہمیشہ میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ میں اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میری کامیابی میں میری بیوی ڈاکٹر یاسمین شاد کا بہت دخل ہے۔ بچے بھی بہت تعاون کرتے ہیں۔

- شاعری، صحافت، براڈ کاسٹنگ، ناول نگاری اور صحافیوں کی جدوجہد میں حصہ لینے کے بعد ان مشاغل کے علاوہ بھی کوئی کام آپ کرنا چاہتے ہیں؟

☆ جی ہاں۔ ایک کام ہے جو ناول نگاری کی وجہ سے نامکمل ہے۔ میں صحافت میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا، میرے مقالے کا عنوان تھا ''تیسری دنیا میں صحافت'' یہ کام تقریباً مکمل ہے۔ اگر عمر اور صحت نے وفا کی تو انشاءاللہ پی ایچ ڈی مکمل کرلوں گا۔ ایم اے (آنرز) کے لیے میں نے جو مقالہ لکھا تھا اس کا عنوان تھا ''مغربی ممالک میں تیسری دنیا کے بارے میں رپورٹنگ کی راہ میں حائل مشکلات''۔

سچ لکھنا مشکل ہے، لیکن لکھو تو سچ لکھو

نئی دہلی، 15 مئی (یو این آئی) آسٹریلیا جا کر بسنے والے مشہور صحافی اور ناول نگار اشرف شاد کا کہنا ہے کہ سچ لکھنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے اس کے لیے آپ کو بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ہندو پاک کے بارے میں رائے زنی کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اگر ہندوستان اور پاکستان کو ترقی کرنا ہے تو انہیں جنگ کی باتوں اور ہتھیاروں کی دوڑ سے بچنا ہوگا اور بڑھتی ہوئی آبادی پر کنٹرول کرنا ہوگا۔

سڈنی میں ایس بی ایس ریڈیو کی اردو سروس کے سربراہ مسٹر شاد نے یو این آئی کے ساتھ ایک انٹرویو میں بتایا کہ پاکستان کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ ایسے میں ''جنگی جنون'' اور ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ دراصل ملک کے اصل مسائل سے منہ موڑنا ہے۔ ہندوستان کو بھی اپنے یہاں اس بات کا دھیان رکھنا چاہئے۔

مرادآباد میں پیدا ہونے والے مسٹر شاد اپنے مقبول ناول ''بے وطن'' کے ہندی ترجمہ کی اشاعت کے سلسلے میں ان دنوں ہندوستان آئے ہوئے ہیں۔ ان کے ناول کا یہاں سنیچر کے روز اجراء ہوا ہے۔ اس ناول کو 1997ء میں پاکستان کا باوقار وزیر اعظم ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ 54 سال شاد شاعری بھی کرتے ہیں۔ 1996ء میں ان کا ایک مجموعہ ''نصاب'' منظر عام پر آچکا ہے۔ گزشتہ سال انہوں نے وزیر اعظم کے نام سے سیاسی ناول لکھا ہے اور آج کل وہ ''صدر محترم'' کے نام سے ایک اور سیاسی ناول لکھنے میں مصروف ہیں۔

مسٹر شاد بہت انقلابی صحافی رہے ہیں اور آزادی اظہار کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق کے عہد حکومت میں جیل کی سزا بھی کاٹ چکے ہیں۔ قبل ازیں

جنرل یحییٰ خاں کی فوجی حکومت میں اخباروں کی ملک گیر ہڑتال میں شامل ہونے کی وجہ سے اپنی نوکری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ سچ لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن صحافی ہونے کے ناطے یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں اور جو دیکھتے ہیں اسے اسی طرح لوگوں کے سامنے لائیں اور اپنے پیشے سے ایمانداری برتیں۔ اسی ایمانداری کی وجہ سے انہیں صعوبتیں جھیلنی پڑیں یہاں تک کہ ترک وطن کرنا پڑا۔

انہوں نے بتایا کہ آج کل تو پھر بھی اخباروں میں کافی کچھ لکھا جاتا ہے مگر اس زمانہ میں اتنی آزادی نہیں تھی۔ انہوں نے ''معیار'' نامی مشہور ہفتہ وار نکالا جس میں سرکاری دستاویز چھاپنے کے جرم میں اس رسالہ کو ضبط کرلیا گیا۔

مسٹر شآد نے ''معیار'' بند ہونے کے بعد اسے چار چار علیحدہ ناموں سے نکالا جس پر فوجی حکومت نے پابندی لگادی۔ جب یہ جرائد بند ہوگئے اور مقدمہ شروع ہوا تو 1980ء میں مسٹر شاد خود جلاوطن ہوکر نیویارک چلے گئے۔ وہ وہاں ایسٹرن نیوز کارپوریشن کے منتظم بن گئے۔ اس کے بعد 87-1983ء میں بحرین اور 89-1987ء میں کویت میں رہے۔ آخرکار 1989ء میں آسٹریلیا کی شہریت اختیار کرکے سڈنی میں بس گئے اور اتنے ملکوں میں رہ کر انہوں نے جو پہلا ناول لکھا وہ ''وہ بے وطن'' تھا، جس میں انہوں نے اپنے اور اپنے جیسے دیگر لوگوں کی بے وطنی کے اسباب اور مسائل کو کہانی کی شکل دی ہے۔

اپنے ناولوں کے موضوعات کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر شآد نے کہا کہ بے وطن کے علاوہ ان کے دیگر دو ناول سیاسی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ سڈنی میں ہندوستانی مسلم دوشیزہ اور مہاجر مسلم نوجوان کے عشق کے ذریعہ ''بے وطن'' میں پاکستان کے مسئلہ کو رکھا گیا ہے۔ یہ دریافت کیے جانے پر کہ کیا اس میں مصنف کے نجی تجربات شامل ہیں کیونکہ وہ خود ہندوستان سے پاکستان اور پھر پاکستان سے سڈنی جا کر بسے ہیں مسٹر شآد نے کہا کہ انہیں اپنے تجربات سے یہ ناول لکھنے میں کافی مدد ملی ہے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ انہوں نے چونکہ خود ''بے وطنی'' جھیلی ہے اور دوسرے لوگوں کو بے وطنی کے مسائل سے دوچار ہوتے دیکھا ہے اس لیے اس موضوع کو بڑی خوش اسلوبی سے اور ساتھ ہی دلچسپ انداز میں برتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس میں بہت سی سچی کہانیاں بھی شامل ہیں۔

البتہ ان کے کرداروں کے تجربات صرف وہی نہیں ہیں جو ان کے اپنے تجربات ہیں۔
ان کے ناول میں ایک شعر ہے۔

یہ کیا ستم ہے کہ میں جس زمین پہ پاؤں رکھوں
اُسی زمین کا محور ہٹا ہوا نکلے

اشرف شاد نے بتایا کہ انہوں نے اپنے دوسرے ناول "وزیر اعظم" میں "پاور مافیا" کو ایکسپوز کیا ہے اور وزراء اعظم کی نجی زندگی کے تضادات کو پیش کر کے پاکستان کے سیاسی حالات کی تلخ تاریخ بیان کی ہے۔ یہ ناول کافی موضوع بحث رہا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس ناول کا مرکز نواز شریف ہیں لیکن میں نے اپنے کردار کو ایک علامت بنایا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اس ناول کے اگلے سلسلے کے طور پر "صدر محترم" کے عنوان سے لکھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ناول بھی سیاسی ہے اور اس میں پاکستان کے مستقبل کے بارے میں تشویش ظاہر کی گئی ہے۔

اپنے حالات زندگی کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ کراچی کے اردو کالج سے بی اے کرنے کے بعد انہوں نے قانون کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر 1966ء میں صحافت میں قدم رکھا تھا اور روز نامہ مشرق، اعلان، حریت اور ہفت روزہ الفتح سے وابستہ رہے۔

خلیج میں آنے کے بعد وہ عرب ٹائمز اور گلف مرر میں بھی مختلف عہدوں پر رہے اپنی بے وطنی کے دوران انہوں نے حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا ہے اور سڈنی کے نیو ساؤتھ ویلز یونیورسٹی سے ایم اے آنرز اور ہنگری کے بڈاپسٹ کے بین الاقوامی صحافتی ادارے سے صحافت کا ڈپلومہ حاصل کیا۔

مسٹر شاد نے ہندو پاک کی زندگی کے بارے میں کہا کہ اگر کسی کو ترقی کرنا ہے تو اسے اپنی بڑھتی آبادی پر کنٹرول کرنا ہوگا لیکن ہندو پاک دونوں جگہ اس اہم سوال پر دھیان نہیں دیا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں ہر سال ایک آسٹریلیا کے برابر آبادی بڑھتی ہے تو پاکستان میں لبنان جتنی آبادی کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ حالت یہ ہے کہ پانچ اسکول کھلتے ہیں تو دس اسکولوں کے برابر بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ پاکستان کی معاشی حالت دگرگوں ہے وہاں بھی اب پڑھنے لکھنے کا ماحول نہیں رہا۔ الیکٹرانک میڈیا کے اثر سے وہاں کتابیں کم چھپ رہی ہیں ان کے خریدار نہیں ہیں۔

ناشر، مصنفین کا استحصال کر رہے ہیں مجھے بتایا جاتا ہے کہ ہندوستان میں بھی کم وبیش یہی صورتحال ہے۔

یہ پوچھے جانے پر کہ پاکستان میں اب کیسی حالت ہے، مسٹر شاد کا کہنا ہے کہ ناول اچھے نہیں لکھے جارہے ہیں البتہ شاعری کی حالت اچھی ہے فیض اور حبیب جالب نے نئی راہ دکھائی ہے۔

(یو این آئی ۲۰۰۰ء)

ہجرت کرنا ہمارا آبائی مشغلہ ہے

سڈنی میں اشرف شاد کی شہرت کی ایک وجہ ان کی شاعری بھی ہے۔ وہ غزل گو شاعر ہیں اور مشاعروں میں بڑے خوب صورت ترنم سے پڑھتے ہیں۔ ان کی اہلیہ ڈاکٹر کنیز فاطمہ شاؔد جو اپنے گھریلو نام یاسمین کے نام سے زیادہ جانی جاتی ہیں۔ نیورو فزیالوجسٹ ہیں اور حال ہی میں اپنی پی۔ایچ۔ڈی مکمل کرنے کے بعد سڈنی کی یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز کے اسکول آف میڈیسن میں ریسرچ کر رہی ہیں۔ یاسمین ایک زمانے تک افسانے لکھتی رہی ہیں اور شاعری بھی کرتی ہیں۔ ہم نے ان کی زندگی کے ان گوشوں کو بے نقاب کرنا چاہا ہے جن کے بارے میں لوگ واقفیت نہیں رکھتے۔ (مدیرہ)

کنیز فاطمہ: شاؔد صاحب! کچھ اپنے ابتدائی حالاتِ زندگی کے بارے میں بتائیے، پاکستان کب آئے، تعلیم کیا اور کہاں حاصل کی؟

اشرف شاد: چند نسلوں قبل میرے آباؤ اجداد آذربائیجان چھوڑ کر احمد شاہ ابدالی کے لشکر میں شامل ہو کر ہندوستان آئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ موجودہ یوپی میں مراد آباد کے آس پاس کے علاقے کی بہت سی زمینیں ان کے نام ہوئیں اور وہیں کے صوبیدار بھی مقرر ہوئے۔ میری پیدائش وہیں کی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد پاکستان آتے آتے چھ سات برس لگ گئے۔ میرے دادا بہت کٹر قوم پرست اور سخت انگریز دشمن تھے۔ کبھی انگریز کی بنائی ہوئی کوئی چیز استعمال کی نہ پہنی۔ کھدر کا بنا ہوا شرعی کرتا شلوار پہنتے تھے۔ انگریزی پڑھنے کو کفر سمجھتے تھے۔ سخت مذہبی تھے اور مولانا اشرف علی تھانوی کے عقیدت مندوں میں سے تھے، میں ان کے

سب سے بڑے بیٹے کی پہلی اولاد تھا اس لیے میرا نام اشرف بھی ان کی اسی عقیدت کا اظہار تھا۔ پیشہ زمینداری تھا اور ان کے انتقال کے بعد میرے والد نے آبائی زمینوں کا انتظام سنبھالا لیکن زیادہ وقت خاندانی جھگڑوں اور مقدمے بازیوں کی نذر ہوتا تھا اس لیے پاکستان ہجرت کرنے کی ایک یہ بھی وجہ تھی۔ پھر میرے اکثر چچا اور ماموں جو کالجوں میں پڑھتے تھے وہ سب پاکستان بنتے ہی ہندوستان چھوڑ گئے تھے لہٰذا ۱۹۵۲ء میں ہم بھی پاکستان آ گئے۔ پہلے چند سال کراچی میں گزارے پھر پنجاب کے شہر کیمبل پور (موجودہ اٹک) ہجرت کر گئے، میں نے میٹرک تک وہیں تعلیم حاصل کی جس کے بعد ہم لوٹ کر پھر کراچی آ گئے۔ والد انجینئر بنانا چاہتے تھے لیکن مزاج شروع ہی سے بہت عاشقانہ اور طبیعت باغیانہ تھی، اپنے دور کی ادبی اور سیاسی تحریکوں میں بہت چڑھ کر حصہ لیتا تھا اور کالج کے ابتدائی سالوں ہی میں سائنس کی تعلیم کو خیر باد کہہ کر تاریخ، ادب اور سیاسیات کو اپنی تعلیم کا محور بنالیا تھا، حالات کے دباؤ نے جب مجبور کیا تو پیشے کے طور پر صحافت جیسے مشکل پیشے کو اپنالیا۔ مشکل اس لیے کہ پاکستان میں اس وقت (۶۶ء یا ۶۷ء کے زمانے کی بات ہے) صحافت کے شعبے میں کام زیادہ اور پیسے کم تھے۔ قانون کی تعلیم بھی حاصل کی، لیکن فائنل ایئر کے آخری دو پرچے نہ دے سکا۔ لہٰذا وہ ادھوری رہ گئی۔

کنیز فاطمہ: اور یاسمین کچھ آپ کہیں، آپ کی تعلیم کا یہ سلسلہ جو کہ ابھی تک جاری تھا وہ کس کس موڑ سے گزرا؟

یاسمین: بھئی میری داستان اشرف کی طرح رنگین تو نہیں لیکن محور اس کا بھی وہی ہے جو کہ آپ نے اشرف کی باتوں سے اخذ کیا ہوگا۔ یعنی جدوجہد، جدوجہد اور سخت جدوجہد۔ میرے والدین کا تعلق حیدرآباد دکن کے ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ میرے والد علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے جو پاکستان کی تحریک کا گڑھ تھی اس لیے وہ ملک بنتے ہی ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ میں پاکستان میں پیدا ہوئی اور مجھے اس پر بڑا فخر ہے کہ پاکستان کی اس نسل سے میرا

تعلق ہے جو پاکستان میں پیدا ہوئی، وہیں پلی بڑھی، پروان چڑھی اور وہیں جس نے اپنی تعلیم اور کیریئر کو فروغ دیا۔ میں نے اپنی ڈاکٹریٹ تو اب یہاں سڈنی میں مکمل کی ہے لیکن اس کی بنیاد پاکستان ہی میں پڑی تھی جہاں کراچی یونیورسٹی سے فزیالوجی میں ایم۔ایس۔سی کیا، پوزیشن بھی لی اور جس کے بعد پاکستان چھوڑنے تک سندھ میڈیکل کالج کے فزیالوجی ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ رہی۔ پی۔ایچ۔ڈی میں پاکستان میں ہی کرنا چاہتی تھی لیکن وہاں میری فیلڈ میں ایسی سہولتیں نہیں تھی جیسی مغرب میں ہیں، پھر شادی اور بچوں کا سلسلہ شروع ہوا، پاکستان بھی چھوڑنا پڑا، اشرف جس زمانے میں نیویارک میں تھے تو وہاں کے البرٹ آئن اسٹائن میڈیکل کالج میں پی۔ایچ۔ڈی کے لیے داخلہ مل بھی گیا تھا لیکن بحرین چلے آئے اور یہ خواب پھر ادھورا رہ گیا، اسی لیے ہم جب آسٹریلیا آئے تھے تو حالات کے تمام تر دباؤ کے باوجود میں نے یہاں سب سے پہلا کام یہی کیا کہ یونیورسٹی میں داخل ہوئی اور اپنی ریسرچ کو مکمل کر کے ہی چھوڑا۔

کنیز فاطمہ: آپ دونوں کا تعلق دو مختلف شعبوں سے ہے تو آپ ملے کس طرح، یا آپ دونوں کی شادی والدین نے طے کی تھی؟

یاسمین: شادی تو بالآخر والدین کی ہی مرضی سے تھی لیکن ہم شادی سے پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اشرف نے اس زمانے میں اسٹوڈنٹس رائٹرز گلڈ بنائی تھی جو کراچی میں نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی نمائندہ تنظیم تھی۔ اس کے تحت ہر سال بابائے اردو یادگاری ایوارڈ دیے جاتے تھے، ایک سال اس مقابلے میں میں بھی شریک ہوئی تھی اور ایک انعام مجھے بھی ملا تھا، اسی موقع پر اشرف سے ملنے کا موقع ملا اور گلڈ میں میں بھی ان کے ساتھ سرگرم ہوگئی۔ میں اخباروں میں کراچی یونیورسٹی کی سرگرمیوں پر کالم لکھتی تھی اور ریڈیو پر پروگرام بھی کرتی تھی اور اشرف کے لیے اخبار اور ریڈیو ان کا دوسرا گھر تھے اس لیے ان سے ملنا جلنا بڑی پابندی سے جاری رہا۔ ۱۹۷۴ء میں ہم دونوں کے والدین نے ایک دوسرے سے مل کر ہماری شادی باضابطہ طور پر طے کردی، لیکن اسی سال اشرف یورپ

چلے گئے جہاں سے ان کی واپسی کے بعد اکتوبر ۷۵ء میں ہماری شادی ہوگئی۔

کنیز فاطمہ: اور بچے؟

یاسمین: ثمن ہماری بیٹی ہے اور گذشتہ سال ایچ۔ ایس۔ سی کر کے اب یو ٹی ایس میں کمپیوٹر سائنس پڑھ رہی ہے۔ میرا خیال تھا ڈاکٹر بنے گی لیکن اس کا رجحان لٹریچر کی طرف ہے۔ کتابوں کا کیڑا ہے۔ بیٹا ارسلان ابھی دسویں میں ہے اور سلمان میاں ابھی صرف نو سال کے ہیں۔

اشرف شاد: یاسمین اور میں نے کبھی بھی روزگار کے لیے پاکستان چھوڑ کر باہر جانے کو اپنی منزل نہیں بنایا تھا۔ ہم نے اپنے کیریئر کی عمارت پاکستان میں تعمیر کی تھی جس کی ایک ایک اینٹ کے پیچھے ہماری جدوجہد کی کہانی لکھی تھی۔ لیکن ضیاء الحق صاحب کے مارشل لاء کے زمانے میں حالات نے ملک چھوڑنے کے علاوہ کوئی اور راستہ باقی نہ رکھا۔ پاکستان میں آزادئ تحریر وتقریر کی تحریکوں سے میرا بڑا سرگرم تعلق رہا ہے۔ پریس لاز جنہیں ہم بلیک لاز کہتے تھے ان کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے سب سے پہلے میں ۱۹۷۳ء میں بھٹو صاحب کے زمانے میں جیل گیا تھا اور دو ہفتے لاہور کی کیمپ جیل کی میزبانی میں گزارے تھے۔ ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء لگا تو اس وقت میرا اپنا رسالہ ہفت روزہ 'معیار' نکلتا تھا جس کا کراچی میں اپنا پریس تھا۔ معیار فوجی حکومت اور اس کے مظالم کے خلاف بھرپور طریقے سے لکھتا رہا اور میرا پریس شاید وہ واحد پریس تھا جو کراچی میں فوجی حکومت کے خلاف چھپنے والے پرچوں کو چھاپتا تھا۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ معیار چار دفعہ مختلف ناموں سے نکل نکل کر بند ہوتا رہا اور آخر میں پریس سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ ۱۹۷۸ء میں مارشل لاء کے ضابطہ ۱۲ کے تحت گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ کئی مہینے کراچی اور حیدرآباد کی جیل میں گزارے۔ رہا ہوا تو معاش کے سارے راستے بند تھے، عدالتوں میں مقدمے الگ قائم تھے۔ لہٰذا جلاوطنی کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ ۱۹۸۰ء میں جلاوطنی کی راہ اختیار کی اور امریکہ چلا گیا۔ یاسمین اپنے بھائی کے پاس بحرین چلی گئیں۔ نیویارک میں تین سال رہا

پھر فیصلہ بحرین کے حق میں ہوگیا جہاں یاسمین پہلے ہی یونیورسٹی میں پڑھا رہی تھیں اور مجھے بھی وہاں کے اخبار گلف مرر Gulf Mirror میں ایک اچھی آفر ہوگئی تھی۔ یاسمین کے بھائی افتخار اور ان کے بعد ان کے والدین اور بھائی بہن آسٹریلیا آئے اور ہمیں امیگریشن ملی تو ہم نے بھی یہاں کی راہ اختیار کی۔ گلف کی بہت اچھی اور آرم دہ زندگی چھوڑ کر ان دیکھی دنیا میں آنا ایک مشکل فیصلہ تھا لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ ہجرت ہمارا آبائی مشغلہ ہے اسی لیے چلے آئے اور اب دیکھیے کہ یہاں کے بعد اور کس دنیا کی سیر ہوتی ہے۔

کنیز فاطمہ: اب اپنی شاعری کے بارے میں کچھ بتایئے، کب اور کیسے شروع کی ہے؟

اشرف شاد: صحافت کے مقابلے میں میری شاعری کی حیثیت بہت ثانوی رہی ہے۔ جب ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا تو نثر نگاری کو ہی اظہار کا ذریعہ بنایا، لیکن طبیعت کی رومانیت نے پھر غزل گوئی کی طرف مائل کیا۔ پاکستان میں میری شاعری کا یہ دور بہت مختصر رہا ہے۔ ۶۷ء کے دو تین سال جو شاعری کی وہ حد سے زیادہ بڑھی ہوئی صحافتی مصروفیات میں گم ہوگئی۔ نیویارک کی جلاوطنی کا دور بھی سیاسی اور صحافتی گتھیوں کے سلجھانے میں گزر گیا، لیکن گلف میں جو سات آٹھ سال گزارے ان میں ذریعہ اظہار شاعری کے علاوہ اور کچھ نہیں رہا تھا اس لیے غزلیں بھی زور شور سے ہوئیں اور موضوعاتی اور جدید انداز کی نظمیں بھی لکھیں۔ یہ سلسلہ سڈنی میں بھی اسی طرح جاری ہے۔

کنیز فاطمہ: اور دوسرا ناقد کون ہے؟

اشرف شاد: یاسمین! وہ میری ناقد بھی ہیں، قدردان بھی اور اکثر اوقات میری واحد سامع بھی۔ جب بھی کوئی غزل ہوتی ہے موقع ملنے پر یاسمین کو سناتا ہوں، اور ہر شعر پر ان کے ردِعمل سے اندازہ کر لیتا ہوں کہ کس شعر میں جان کم ہے اور کونسا شعر اچھا ہوا ہے۔

کنیز فاطمہ: آپ کا کوئی شعر جو خود آپ کو بھی جاندار لگتا ہو؟

اشرف شاد: مجھے تو اپنے بہت سے شعر بہت جاندار لگتے ہیں، ایک شعر میرا ایک زمانے میں

بہت مشہور ہوا تھا جو میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔

مجھ کو بھی پڑھ کتاب ہوں مضمونِ خاص ہوں

مانا ترے نصاب میں شامل نہیں ہوں میں

۱۹۶۷ء میں ریڈیو پاکستان کراچی کے جشن طلبہ کے مشاعرے میں پہلی بار یہ غزل پڑھی تھی اور انعام بھی جیتا تھا۔ اس کی بعد غالباً ۶۹ء یا ۷۰ء میں نیرنگِ خیال کے جدید شاعری نمبر میں نوجوان اور نئے شعراء پر ابوالخیر کشفی نے جو ایک تنقیدی جائزہ لکھا تھا اس میں چار نمائندہ شعر چنے تھے جن میں ایک یہ بھی تھا۔ باقی تین شعر نقاش کاظمی، نصیر ترابی اور ثروت حسین کے تھے۔

کنیز فاطمہ: کوئی شاعر جس نے آپ کو بہت متاثر کیا ہو؟

اشرف شاد: ایک طویل فہرست ہے، شاعروں کو پسند کرنے کے معاملے میں میرا ایک علیحدہ معیار ہے، میں انہیں صرف شاعری کے حوالے سے نہیں بلکہ ان کی ذات کے حوالے سے بھی دیکھتا ہوں۔ میں جوش، فیض، فراز اور جالب کے قبیلے کے شاعروں کا بہت احترام کرتا ہوں۔

میں ادب میں نظریاتی مباحث سے خود کو الگ رکھتا ہوں

- آپ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کب کیا تھا؟

☆ یہ غالباً 1960ء کی بات ہے، دورِ طالبعلمی سے ہی میں لکھ رہا ہوں، صحافت کے مقابلے میں میری شاعری کی حیثیت بہت ثانوی رہی ہے۔ جب ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا تو نثر نگاری ہی کو ذریعۂ اظہار بنایا، لیکن طبیعت کی رومانیت نے غزل گوئی کی طرف مائل کر دیا، پاکستان میں میری شاعری کا دور بہت مختصر رہا۔ 1967ء کے دو تین برسوں کے دوران جو شاعری کی وہ حد سے زیادہ بڑھی ہوئی صحافتی مصروفیات میں گم ہوگئی۔ نیویارک کی جلاوطنی کا دور بھی سیاسی اور صحافتی گتھیوں کو سلجھانے میں گزر گیا، لیکن گلف میں جو سات، آٹھ سال گزارے، ان میں ذریعۂ اظہار شاعری کے علاوہ کچھ نہیں رہا۔ اس دور میں کافی غزلیں کہیں، موضوعاتی اور جدید انداز کی نظمیں بھی لکھیں۔ یہ سلسلہ سڈنی میں بھی اسی طرح جاری رہا۔ شاعری میں جہاں تک استاد، شاگرد کا معاملہ ہے وہ پرانے زمانے میں ہوتا تھا، جن لوگوں سے میں مشورہ کرتا رہا ہوں ان میں سرفہرست نقاش کاظمی کا نام ہے، وہ اور میں کالج کے زمانے کے دوست ہیں۔ شعر گوئی کے مقابلوں میں بھی ہم دونوں اپنے کالج کی نمائندگی کرتے تھے ہماری دوستی آج بھی اسی طرح برقرار ہے۔

- آپ کا نظریۂ ادب کیا ہے؟

میں ادب میں نظریاتی مباحث سے خود کو الگ رکھنا چاہتا ہوں۔ ادب میں نظریاتی جنگ آج بھی جاری ہے، میں ان مباحث کا حصہ نہیں ہوں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں ادب کی بنیادی رو سے کٹا ہوا ہوں۔ میں کوئی پیغامبر یا اصلاح کار نہیں ہوں، میں تو کہانی لکھنے کی

کوشش کر رہا ہوں۔ میں بڑے ادیبوں یا نقادوں کے لیے ناول نہیں لکھتا۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ ایک عام قاری بھی میرے ناول کی زبان سمجھ سکے۔ میرا نظریہ، یہ ہے کہ کہانی خود تخلیق نہیں ہوجاتی، کہانی آپ کو ڈھونڈنا پڑتی ہے۔اس کے بعد یہ آپ کی فنکاری ہے کہ آپ اس کو کیسا لباس پہناتے ہیں، اس کو کیا شکل دیتے ہیں۔ میرے دامن میں بے تحاشا کہانیاں ہیں، میں بہت سے ملکوں میں گھوما ہوں اور رہا بھی ہوں، میں نے بہت سی کہانیاں قریب سے دیکھی ہیں، میں ان کہانیوں کو لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ''بے وطن'' میں سماجی اور معاشرتی معاملات ہیں، لیکن ''وزیراعظم'' میں سیاسی کہانیاں ہیں۔

● افسانوی تجربے سے گزرے بغیر، آپ ایک ہی جست میں ناول نگار کیسے بن گئے؟

☆ افسانہ نگاری کا معاملہ بھی شاعری کی طرح ہے، جسے آسان سمجھ کر ہر آدمی شروع کر دیتا ہے۔ میں نے دورِ طالب علمی میں شاعری کے ساتھ ساتھ افسانے بھی لکھے ہیں۔ میں نے اس زمانے میں عبیداللہ بیگ کو اپنا ایک افسانہ دکھایا تو انہوں نے اپنی رائے دی کہ آپ افسانہ ضرور لکھیں، لیکن ابھی نہیں پہلے پڑھیں، پھر مضمون نگاری کریں۔ان کا مقصد یہ تھا کہ پہلے شعور کو پختہ کریں، پھر افسانہ لکھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ افسانہ لکھنا، ایک مشکل کام ہے۔ میں نے اس کے بعد افسانہ کبھی نہیں لکھا۔اس کے بعد میں نے مضمون نگاری کا آغاز کیا اور اسی حوالے سے صحافت میں آیا، لیکن میرے اندر ایک افسانہ نگار موجود تھا، اس زمانے میں، میں نے کئی ناولوں کے تراجم کیے، جو چھپے بھی۔ میرے تراجم اور تحریروں کو دیکھ کر، میرے دوستوں نے کہا کہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ تم نے افسانے نہ لکھے ہوں۔ جب میں نے اپنا ناول ''بے وطن'' لکھنا شروع کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں لکھ سکتا ہوں۔ شاید میرے ناولوں کی خوبی یہی ہے کہ میں نے اپنے افسانوں کو ناول نہیں بنایا، میں نے ناول کو ناول کے طور پر ہی لکھا ہے لیکن میں افسانے لکھنا چاہتا ہوں، میرے اندر بہت سے افسانے تڑپ رہے ہیں۔

● وہ کون سے جذبات واحساسات تھے' جنہوں نے آپ سے ناول تخلیق کروائے؟

☆ میں پاکستان سے دور کبھی نہیں رہا۔ جغرافیائی اعتبار سے ضرور دور ہوں، پر فیشنلی بھی میرا تعلق پاکستان واچنگ سے رہا ہے۔ میں آسٹریلیا ریڈیو سے اردو پروگرام کرتا ہوں، وہ بھی پاکستان سے جن کا تعلق ہے ان کے لیے۔ میں پاکستان ہی کی مارکیٹ کے لیے لکھتا ہوں۔ میں نے

اپنے ناول امریکہ، یورپ یا آسٹریلیا میں مارکیٹ نہیں کیے، میں باہر بیٹھ کر پاکستان کے لیے زیادہ بہتر انداز سے لکھ رہا ہوں۔ میں پاکستان کے لیے اس لیے لکھتا ہوں کہ پاکستان سے میرا جذباتی رشتہ قائم ہے۔ میرے دونوں ناولوں کا موضوع پاکستان ہی ہے۔

- جب آپ کے پہلے ناول ''بے وطن'' کو اکادمی ادبیات پاکستان نے 1997ء کے بہترین ناول کا اعزاز سرکاری طور پر دیا تو اس وقت آپ کے کیا احساسات تھے؟

☆ میرے پہلے ناول ''بے وطن'' کو جب اکادمی ادبیات پاکستان نے 1997ء کے بہترین ناول کا ''وزیراعظم ادبی ایوارڈ'' دیا تو مجھے خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی تھی۔ میرے لیے زیادہ بڑا اعزاز ''بے وطن'' کی تحسین میں کہے گئے، ان بزرگوں اور دوستوں کے الفاظ تھے جنھیں میں ادب کے حوالے سے محترم اور قابلِ تعظیم سمجھتا ہوں۔

- آپ نے اپنے ناول کا نام ''وزیراعظم'' کیوں رکھا، کیا اس کا کوئی سیاسی پس منظر ہے؟

☆ میں سیاسی فکشن لکھنا چاہتا تھا، میرے پہلے ناول ''بے وطن'' میں بھی اس حوالے سے کافی مواد موجود ہے۔ ''وزیراعظم'' ایک خالص سیاسی ناول ہے۔ ایک صحافی کی حیثیت سے میں نے ایک زمانے تک تجزیہ نگاری اور کالم نویسی کی ہے۔ پاکستانی سیاست دانوں کے بارے میں میرا آخری تجزیہ یہ ہے کہ اب ان کے بارے میں سنجیدگی سے کوئی تجزیہ کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ ناول اس اعتبار سے سیاسی پس منظر رکھتا ہے کہ اس کے کرداروں میں صدرِ محترم بھی ہیں، وزیراعظم بھی ہیں، سیاستدان بھی ہیں، فوجی جرنیل بھی ہیں، صاحبِ اقتدار بھی ہیں اور اقتدار میں آنے کے خواہش مند بھی ہیں۔ اس کتاب میں ناول کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ پروفیسر سحر انصاری نے ''بے وطن'' پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''یہ سیاسی شعور کا ناول ہے۔'' میرا ناول ''وزیراعظم'' بھی میرے سیاسی شعور کا ناول ہے۔ اس میں آپ کو اخباری یا صحافتی انداز نہیں ملے گا، میں نے ناول اور کہانی کے تمام لوازمات پورے کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ''وزیراعظم'' شائع کرنے کی بنیادی وجہ تھی۔ اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ ہم کون سا پاکستان چاہتے ہیں، ہم کیا چاہتے ہیں، ہم ایک اچھا پاکستان چاہتے ہیں یا نیا پاکستان، اس کی کیا شکل ہوگی، اسی طرح کے کچھ موضوعات، میری اگلی کتاب ''صدرِ محترم'' میں بھی ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان میں اس طرح کے ناول ابھی تک نہیں لکھے

گئے، یہ بالکل مختلف انداز کے ناول ہیں مجھے یقین ہے کہ میرے ناول، پڑھنے والوں میں اپنی جگہ بنالیں گے۔

● اردو ادب کا، عالمی ادب میں کیا مقام ہے؟

☆ یہ میرے لیے بہت مشکل سوال ہے، اس سوال کا جواب تو اردو ادب کے نقاد بہتر انداز میں دے سکتے ہیں۔ میں اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔

● اردو میں اچھے ناولوں کی کمی کے اسباب کیا ہیں؟

☆ میرا خیال ہے کہ ہمارے لکھنے والوں نے خود کو محدود کرلیا ہے، وہ اپنے اردگرد بکھری ہوئی چیزوں کو نہیں دیکھ رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کوئی بھی تحریر لکھنے کے لیے جرأت اور قوتِ اظہار درکار ہوتی ہے۔ آپ دل میں کوئی خوف رکھ کر نہیں لکھ سکتے۔ اگر آپ یہ سوچیں گے کہ میں جو چیز لکھ رہا ہوں، وہ لوگوں کے معیار پر پورا اترے گی یا نہیں، پتا نہیں اس کے بارے میں نقادوں کی کیا رائے ہوگی، اس طرح آپ کی کوئی چیز پذیرائی حاصل نہ کرسکے گی۔ جو چیز عوامی مقبولیت حاصل نہ کرسکے، ظاہر ہے، وہ کامیاب نہیں ہوگی۔ ہم بہت محدود ہو گئے ہیں، تنگ دائروں میں رہ رہے ہیں، ان سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کررہے۔ ایک معاشرتی الجھاؤ، جس نے ہمارے لکھنے والوں کو بھی متاثر کیا ہے، وہ کنفیوژن کا شکار ہورہے ہیں، یہ تمام وجوہات ہیں، جن کی وجہ سے کوئی بڑی چیز سامنے نہیں آرہی۔

● آپ کے پسندیدہ ناول کون سے ہیں؟

☆ اس سوال کا جواب بھی میرے لیے مشکل ہے۔ میں تقریباً بیس برس سے وطن سے دور ہوں، اس عرصے میں جو چیزیں شائع ہوئیں، وہ مجھ تک نہیں پہنچیں، اس لیے میں کوئی رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ جب میرے دل میں ناول لکھنے کا خیال آیا تو میں نے سوچا کہ دوسرے ناولوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے، پھر میں نے سوچا کہ کوئی ناول پڑھے بغیر لکھوں گا، میں ناول اپنے انداز میں لکھنا چاہتا تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ شعور اور غیر شعوری طور پر کسی کا اثر قبول کروں۔ اب میں کافی ناولوں کا اسٹاک یہاں سے لے جارہا ہوں، ان کو پڑھوں گا اور اگر آئندہ آپ سے یہ بات ہوئی تو یقیناً ان پر اپنی رائے کا اظہار کروں گا۔

● علامتی اور تجریدی تحریک کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

☆ میں علامتی اور تجریدی تحریک کا قائل نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بات واضح انداز میں، بغیر کسی الجھاؤ کے کہنی چاہئے۔ تجریدیت کی ہمیں ضرورت نہیں ہے، یہ سب کنفیوژن کی پیداوار ہے، کہانی کو بالکل واضح انداز میں عوام تک پہنچنا چاہئے۔ تجریدیت اور علامت کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب کوئی بات کہنے میں کوئی خطرہ یا خوف ہو۔

● آپ کیوں لکھتے ہیں؟

☆ یہ بہت دلچسپ اور اہم سوال ہے۔ ہمارے لکھنے والوں سے یقیناً یہ سوال کیا جانا چاہئے۔ ایک زمانہ تھا جب خبر لکھتے وقت پانچ کافوں، کب، کیوں، کیسے، کہاں، اور کون؟ جنہیں 5WS بھی کہا جاتا تھا، ان کا خیال رکھنا پڑتا تھا اور ایک ''کاف'' بھی کم ہو تو خبر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی، لیکن ناول نگاری کے اس سفر میں، صرف ایک کاف، یعنی کیوں نے کہ ''میں کیوں لکھتا ہوں'' اور نہ صرف لکھتا ہوں بلکہ اپنی تحریر کو چھپی ہوئی کتاب کا درجہ بھی دیتا ہوں، تو کیوں؟ یہ کیوں اس لیے اہم ہے کہ میں جس ملک میں رہتا ہوں، وہاں کی دنیا ماحولیات کے بارے میں بہت حساس ہے، وہاں بغیر اجازت درخت کاٹنا قانوناً جرم ہے اور وہاں کتابوں کو بھی درختوں کے حوالے سے ناپا جاتا ہے۔ جب کوئی کتاب چھپتی ہے تو یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت پر جو کاغذ خرچ ہوا ہے، اسے حاصل کرنے کے لیے کتنے پیڑ کاٹے گئے ہوں گے، اور کتنے درختوں کا خون ہوا ہوگا اور پھر کتاب کے متن کو جانچ کر یہ یقین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ قتل واجب بھی تھا کہ نہیں۔ میری کتابیں پاکستان میں چھپی ہیں، جہاں جنگلات کا تناسب 24 فیصد کے عالمی معیار کے بجائے صرف چار فیصد ہے۔ میں یہ کہنے کی کوشش نہیں کر رہا کہ پاکستان میں جنگلات کی کمی کی وجہ وہ اہل قلم ہیں جو اہل کتاب بھی ہیں لیکن یہ ضرور ہوا کہ میرے لیے ''کیوں'' کا یہ مسئلہ زیادہ اہم ہو گیا ہے کہ ''ہم کیوں لکھتے ہیں'' پھر اپنی تحریر کو کتاب کا درجہ کیوں دیتے ہیں۔ میں اپنی تحریروں کو کتاب بنانے سے پہلے اس بات کا گہری نظر سے جائزہ ضرور لیتا ہوں کہ کیا واقعی اس کتاب کے چھپنے کی ضرورت ہے۔

(روزنامہ ''جنگ'' 29 ستمبر 1999ء)

وطن واپس آ کر کیا کریں؟

شاعر، صحافی اور ادیب اشرف شآد ۱۹۸۰ء میں پاکستان سے آسٹریلیا منتقل ہوئے۔ اوورسیز پاکستانیوں کی اکثریت کی طرح ان کی منتقلی کی وجہ معاشی نہیں تھی۔ ان کا اشاعتی ادارہ حکومتی عتاب کا شکار تھا۔ ان کے پاس خودساختہ جلاوطنی کے علاوہ دوسرا راستہ کوئی نہ تھا۔ اشرف شآد آج کل آسٹریلیا کے نشریاتی ادارے اسپیشل براڈ کاسٹنگ سروس کی اردو زبان کی نشریات کے سربراہ ہیں (اس ادارے کے تحت ۶۸ زبانوں میں پروگرام نشر کیے جاتے ہیں)۔ وہ ہر سال پاکستان آتے ہیں۔ اپنے موجودہ دورۂ پاکستان میں اشرف شآد سے 'بلادی کی مہمان' کے سلسلے میں جو گفتگو ہوئی ہے وہ درج ذیل ہے:

یاسمین طٰحہٰ: حکومت کی تبدیلی سے پاکستان کے حالات میں کچھ فرق نظر آتا ہے؟

اشرف شآد: اس وقت پاکستان غیر یقینی کی صورتِ حال کا شکار ہے۔ یہاں موجود لوگوں کی شکلوں پر خوف نظر آتا ہے۔ اکثر لوگ اپنی نوکریوں کے حوالے سے خوفزدہ ہیں۔ انہیں خوف ہے کہ ان کی نوکریاں ختم نہ کر دی جائیں۔ نئی ملازمتوں کا حصول مشکل نظر آ رہا ہے۔ ملک میں ایسی معاشی سرگرمیاں نظر نہیں آتیں جن کی وجہ سے نوکریاں دستیاب ہوں۔

یاسمین طٰحہٰ: آپ نے کبھی وطن واپسی کے بارے میں سوچا ہے؟

اشرف شآد: ایک طویل عرصہ آسٹریلیا میں گزارنے کے بعد اب یہ ممکن نہیں ہے۔ جب شروع میں آسٹریلیا گئے تو ہر لمحہ یہ سوچتے تھے کہ عنقریب وطن واپس جائیں گے، اب نہیں۔

یاسمین طٰحہ: کیا عوامل ہیں جو پاکستانیوں کی وطن واپسی کی راہ میں رکاوٹ ہیں؟

اشرف شاؔد: اکثر کا خیال ہے کہ وطن واپس آ کر کیا کریں گے؟ یہی سوال واپسی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ بہت سے لوگ وطن کی محبت میں باہر سے اچھی ملازمتوں کو چھوڑ کر واپس آئے۔ لیکن یہاں کے حالات نے انہیں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔

یاسمین طٰحہ: پاکستان میں کس قسم کے مسائل زیادہ نظر آتے ہیں؟

اشرف شاؔد: اقتصادی مسئلہ اس ملک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ حکومتوں کی تبدیلی کے باوجود یہ مسئلہ اپنی جگہ موجود ہے۔ اس لیے ہمارے ملک میں سیاسی نہیں بلکہ انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ہر حکومت آتے ہی بڑے بڑے دعوے کرتی ہے۔ لیکن نتائج صفر ہوتے ہیں۔ موجودہ حکومت کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ آئندہ چار برس میں بھی ملک میں کوئی خوشگوار تبدیلی رونما ہوگی۔ حالات بد سے بدتر کی طرف جا رہے ہیں۔

یاسمین طٰحہ: پاکستان تو بے تحاشہ مسائل کا شکار ہے۔ اوورسیز پاکستانیوں کو آسٹریلیا میں کن مسائل کا سامنا ہے؟

اشرف شاؔد: وہاں بھی اقتصادی مسائل موجود ہیں۔ اس میں نوعیت کا فرق ہے۔ جو لوگ آسٹریلیا پڑھائی کے لیے آتے ہیں اور ساتھ ہی نوکری بھی کرتے ہیں وہ ایک دو سال میں اپنے اقتصادی مسائل پر قابو پا لیتے ہیں۔ لیکن جو لوگ امیگریشن ویزا پر یہاں آ رہے ہیں۔ ان کو ابتدا میں یہاں سیٹل ہونے کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ آسٹریلیا میں ایک ٹیکسی چلانے والا بھی اتنا پیسہ کما لیتا ہے۔ جتنا ایک ڈاکٹر اپنی پریکٹس سے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں پیشے کے اعتبار سے لوگوں کی عزت کی جاتی ہے۔ جب کہ مغربی ممالک میں کوئی بھی پیشہ کمتر نہیں سمجھا جاتا۔

یاسمین طٰحہ: وہاں پاکستانیوں کو کن سماجی مسائل کا سامنا ہے؟

اشرف شاؔد: اصل مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان سے لوگ وہاں آ کر یہ سوچتے ہیں کہ اس ملک کی تمام سہولتیں کو حاصل کر لیں لیکن ان کے بچے اسی طرح گھر میں بند رہیں جس طرح وہ

پاکستان میں رہتے تھے۔ یہ ایک مشکل امر ہے۔ سارا مسئلہ رویّوں کا ہے۔ قدامت پرست لوگوں کو یہاں مسائل کا سامنا رہتا ہے۔ لیکن رویوں میں تبدیلی پیدا کر لی جائے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔

یاسمین طحٰہ: وہاں مذہب سے دوری کا مسئلہ موجود ہے؟

اشرف شاؔد: بعض صورتوں میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ پاکستان میں ایک ماڈرن طرزِ زندگی گزار رہے تھے وہ مغربی ممالک میں سیٹل ہو کر بے حد مذہبی ہو گئے۔ دراصل وہ لوگ مغربی معاشرے سے بچوں کو محفوظ رکھنے کے لیے مذہب کو ایک شیلڈ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

یاسمین طحٰہ: وہاں آپس میں پاکستانی خاندانوں میں شادی کا رواج شروع ہو چکا ہے؟

اشرف شاؔد: ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اکثر لوگ اب بھی اپنے آبائی گاؤں جا کر رشتہ تلاش کرتے ہیں۔

یاسمین طحٰہ: آپ کی نظر میں پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟

اشرف شاؔد: ہمارے بہت سے مسائل ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ سماجی صورتِ حال بہت بگڑ چکی ہے۔ ہمارے ادارے کبھی مضبوط نہ ہو سکے۔ ان میں تعلیمی ادارے، عدالتی ادارے اور جمہوری ادارے سب ہی شامل ہیں۔ ادارے کیوں مضبوط نہ ہو سکے، اس کے لیے کسی ایک کو الزام دینا درست نہیں۔ اس میں دانشور اور سیاستدانوں کے ساتھ ساتھ عوام بھی شامل ہیں۔

یاسمین طحٰہ: اس کا کیا حل ہے؟

اشرف شاؔد: کسی بھی مسئلے کے حل کے لیے مثالیں قائم کرنی پڑتی ہیں۔ اور مثالیں اوپر کی سطح سے قائم کی جاتی ہیں۔ تمام سیاستدان حکومت کرنے کا دعویٰ رکھتے ہیں لیکن کوئی بھی اپنی کرسی نیک مقصد کے لیے استعمال کرنے پر تیار نہیں ہے۔

(کراچی ۱۹۹۲ء)

اشرف شاؔد سے ایک ملاقات

شاؔد صاحب ایک ہمہ جہت اور ہمہ رنگ شخصیت کے مالک ہیں۔ آسٹریلیا میں رہنے والے اکثر لوگ انہیں براڈ کاسٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اگرچہ وہ ایک کامیاب براڈ کاسٹر ہیں، لیکن یہ ان کی شخصیت کا صرف ایک پہلو ہے۔ بنیادی طور پر وہ صحافی ہیں، صحافت ہی ان کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ پاکستان، بحرین، کویت اور اب آسٹریلیا میں وہ اسی پیشے سے منسلک ہیں۔ پاکستان میں وہ کئی بڑے اخباروں میں کام کر چکے ہیں اسی دوران آزادی صحافت کی جدوجہد میں شریک رہے اسی کی پاداش میں ملازمت سے برطرفی اور پھر جیل کی ہوا کھائی۔ اسی جدوجہد کے نتیجے میں انہیں خود ساختہ جلاوطنی بھی اختیار کرنا پڑی۔ تحقیق کے شعبے میں بھی کچھ وقت گزارا ہے۔ یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز سے ایم اے آنرز کیا تھا اور پی ایچ ڈی کر رہے تھے لیکن تھیسس درمیان میں چھوڑ کر ناول نگاری کی طرف راغب ہو گئے۔ صحافت کے بعد ان کی دوسری پہچان ایک بہت اچھے شاعر کی ہے۔ نصاب کے نام سے ان کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے اور ادبی اور عوامی حلقوں میں خاصا مقبول ہے۔ دوسرا مجموعہ ''آ مرے قریب آ'' زیر اشاعت ہے۔ ان کی شاعری دل و دماغ کے استعمال کا خوبصورت امتزاج ہے۔

صحافت اور شاعری سے آگے بڑھتے ہوئے شاؔد صاحب نے دو ایسے ناول لکھے جنہوں نے ادبی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ ان کے یہ دو ناول ''بے وطن''

اور ''وزیراعظم'' ہیں۔ ''بے وطن'' لکھنے پر شآد صاحب کو ''وزیراعظم ایوارڈ'' بھی ملا ہے۔ کسی ناول نگار کے لئے اس سے بڑا اعزاز کیا ہوگا کہ پہلے ہی ناول پر اتنا بڑا ایوارڈ مل جائے۔ وزیراعظم کے بعد ان کا اگلا ناول ''صدرِ محترم'' زیرِ تحریر ہے۔ ناول نگاری میں شآد صاحب نے عام ڈگر سے ہٹ کر نئی راہ نکالی ہے۔ ''وزیراعظم'' اور ''صدرِ محترم'' دونوں ہی سیاسی موضوع پر ہیں۔ اس خشک موضوع پر اتنا دلچسپ ناول لکھنا شآد صاحب کا ہی کام ہے۔ ایس بی ایس اردو سروس کے انچارج کی حیثیت سے وہ نو سال سے زیادہ عرصے سے کام کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ ان کے کام کو پسند کرتے ہیں اور کچھ کو اعتراضات بھی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے جوابات اور وضاحت پہلی دفعہ لوگوں کو پڑھنے کو ملے گی۔ ہم آپ کے ذہنوں میں موجود سوالات اور شآد صاحب کے جوابات کو الفاظ کی شکل دے کر آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

● آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

☆ میں یوپی کے ایک شہر مرادآباد میں پیدا ہوا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ہمارا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ گیا تھا۔ ہجرت در ہجرت کا یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے۔

● اپنی ابتدائی زندگی، تعلیم اور دیگر مشاغل کے بارے میں بتایئے؟

☆ کہانی بہت رنگین نہیں ہے۔ مسائل اور ان سے نمٹنے کی جدوجہد، ہم میں سے اکثر لوگوں کی یہی کہانی ہے۔ ہمارا آبائی پیشہ زمینداری تھا۔ پاکستان آ کر میرے والد تعلیم کے شعبے سے وابستہ ہو گئے تھے۔ پہلے کراچی میں رہے پھر کیمبل پور جو اب اٹک شہر کہلاتا ہے، وہاں چلے گئے جہاں میرے والد ایک اسکول میں پڑھاتے تھے۔ میں نویں جماعت تک وہیں پڑھتا رہا، پھر کراچی آ کر میٹرک کیا۔ والد انجینئر بنانا چاہتے تھے لیکن میری طبیعت دوسرے جہانوں کی طرف مائل تھی۔ ادب پڑھنے اور پھر لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ طبیعت کی رومان پسندی شاعری کی طرف لے گئی۔ کالج آتے ہی طلبہ کی سماجی اور سیاسی انجمنوں میں سرگرم ہو گیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس کی تعلیم میں دو تین سال ضائع کرنے کے بعد آرٹس میں داخلہ لیا اور اچھے نمبروں سے بی اے پاس کیا۔ اس کے ساتھ اخبار میں ملازمت شروع کر دی۔ کراچی

یونیورسٹی میں ایم اے کرنے کے لیے داخلہ تو لیا لیکن درمیان میں چھوڑ دیا۔ پھر صحافت کے ساتھ قانون کی تعلیم جاری رکھی لیکن آخری سال کے امتحان میں آخری پرچہ اخبار کی مصروفیات کی وجہ سے نہ دے سکا۔ 1974ء میں اپنے اخبار کی طرف سے ایک سرکاری اسکالرشپ پر صحافت کی تعلیم حاصل کرنے یورپ گیا اور ہنگری کے انٹرنیشنل اسکول فار جرنلزم سے ڈپلومہ حاصل کیا۔ یونیورسٹی کی جو تعلیم ادھوری رہ گئی تھی وہ سڈنی آ کر مکمل ہوئی۔

● آسٹریلیا میں جب آپ تعلیم حاصل کر رہے تھے تو پاکستان کی طرح یہاں کی طلبہ سیاست میں بھی حصہ لیا؟

☆ جی ہاں! یہاں بھی یہ سب کچھ کر کے دیکھا اور بہت مزا آیا۔ پاکستان میں جب طلبہ کی سیاست میں سرگرم تھے تو یہ نوجوانی کا اور خواب دیکھنے کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں ہم دنیا کو اور اس کے اس گلے سڑے نظام کو بدلنے کے خواب دیکھتے تھے جس نے زندہ رہنے کے دہرے معیار بنا رکھے ہیں، لوٹنے والوں اور لٹنے والوں کو دو الگ الگ دنیاؤں میں بانٹ رکھا ہے اور طاقت کو سچ کا نام دے دیا ہے۔ خواب دیکھنے کی سیاست آسٹریلیا میں بھی ہوتی ہے۔ لیکن میں روزمرہ پیش آنے والے مسائل کی سیاست سے متعلق ہوا۔ یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز کی اسٹوڈنٹس یونین بہت طاقتور ہے۔ کچھ دوستوں نے مجھے پوسٹ گریجویٹ اسٹوڈنٹس آفیسر کے عہدے کے لیے امیدوار بنایا اور الیکشن جتوایا۔ پوسٹ گریجویٹس کی یونین انڈر گریجویٹ طلبہ کی یونین سے الگ ہو کر آزاد ہوئی تو ہم نے ''ایکشن'' کے نام سے ایک گروپ بنا کر الیکشن لڑا اور اکثر سیٹیں جیتیں۔ میں یونیورسٹی کے بہترین استاد کو منتخب کرنے والی کمیٹی کا بھی رکن رہا۔ ہم صرف منتخب ہی نہیں ہوئے بلکہ ہم نے بہت سے کام بھی کیے جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ میں نے اپنی ان سرگرمیوں کا کبھی اپنے دوستوں سے بھی تذکرہ نہیں کیا۔ آپ کو بھی پہلی بار بتا رہا ہوں وہ بھی اس لیے کہ آپ نے پوچھا تھا۔

● اپنی فیملی اور بچوں کے بارے میں بتائیں؟

☆ میری بیوی ڈاکٹر کنیز فاطمہ شاد جو یاسمین کے گھریلو نام سے پہچانی جاتی ہیں، نیورو فزیالوجسٹ ہیں اور یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز میں پڑھاتی ہیں۔ وہ دماغی امراض پر ریسرچ کر رہی ہیں اور اپنے شعبے میں دنیا بھر کے سائنس دانوں میں پہچانی جاتی ہیں۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے

ہیں۔ بیٹی آن لائن ایڈیٹر ہے، رائٹر بھی ہے۔ حال ہی میں آسٹریلوی نوجوان رائٹرز کی کہانیوں کا مجموعہ ''Anthology'' شائع ہوا ہے جس میں سمن کی کہانی بھی شامل ہے۔ بڑا بیٹا ارسلان پڑھنے کے ساتھ ایک میوزک گروپ سے بھی وابستہ ہے وہ سانگ رائٹر ہے اور حال ہی میں ان کا ایک سی ڈی Ear Infection کے نام سے آسٹریلیا کی مارکیٹ میں لانچ ہوا ہے۔ چھوٹا بیٹا سلمان بھی اسکول میں پڑھ رہا ہے۔ اسے اسٹیج کا شوق ہے اور کئی اسٹیج ڈراموں میں حصہ لے چکا ہے۔

- صحافتی دنیا میں کب آئے اور کن کن منزلوں سے گزر ہوا؟

☆ یہ شاید پچھلی صدی کا قصہ ہے۔ پچھلی صدی گزرے ہوئے صرف دو تین سال گزرے ہیں اس لیے اس سے بھی پچھلی صدی کا قصہ سمجھئے لیکن میرے لیے کل کی طرح ہے۔ یہ قصے سنانا میرا سب سے پسندیدہ مشغلہ ہے، خاص طور پر وہ زمانہ جو پاکستان میں صحافت کرتے ہوئے گزرا ہے۔ میں نے یہ کہانیاں سنانا شروع کیں تو آپ کے اخبار میں کچھ اور چھپنے کے لیے جگہ نہیں بچے گی۔ اپنی صحافتی زندگی کے قصوں کی ایک جھلک ''وزیر اعظم'' میں دکھا چکا ہوں۔

- پھر بھی کچھ چیدہ چیدہ واقعات تو بتایئے۔

☆ دیکھئے اب قدریں بہت بدل گئی ہیں۔ صحافت کرنا اور اخبار نکالنا بہت آسان سمجھ لیا گیا ہے، لیکن اخبار میں صرف ملازمت کرنے اور صحافت کرنے میں فرق ہے۔ ہم نے جب صحافت کو اپنا پیشہ بنایا تو اسے اوڑھنا بچھونا بھی بنایا تھا۔ جیسا میں نے پہلے بتایا وہ خواب دیکھنے کا زمانہ تھا۔ اس لیے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور اصولوں پر قائم رہنے کی ہٹ دھرمی قائم رکھی۔ آج کل پاکستان میں آزادیٔ صحافت کا بہت شور ہے۔ فوجی حکومت ہے لیکن اخبارات آزاد ہیں۔ میں نے آج سے کوئی چودہ پندرہ برس پہلے ایک کالم میں لکھا تھا کہ چھپے ہوئے لفظ کی حرمت ختم ہو گئی ہے۔ یہ تاثر پاکستان میں اکثر دہرایا اور لکھا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب لفظ بے اثر ہو جائیں تو اخبارات کی آزادی Irrelevent یعنی غیر متعلق ہو جاتی ہے۔ آپ کچھ بھی لکھتے رہتے اگر کوئی پرواہ نہیں کرتا آپ بھی تھک کر بیٹھ جائیں گے۔ میں نے پاکستان میں اپنے دور صحافت میں تین فوجی ڈکٹیٹر بھگتے ہیں۔ میرے حق میں خدا کا کرنا بہتر ہوا ہے کہ چوتھے ڈکٹیٹر کے زمانے میں پاکستان میں نہیں ہوں۔ میں نے روزنامہ حریت سے صحافت کا

آغاز کیا تھا۔ میں جن سینئر لوگوں کے ساتھ بیٹھتا تھا وہ سب بعد میں اخباری دنیا کے بڑے نام بنے۔ نیرؔ علوی، جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، جسارت، نوائے وقت اور پاکستان ایکسپریس کے ایڈیٹر ہوئے۔ صلاح الدین جنہوں نے بعد میں تکبیر نکالا تھا، متین الرحمٰن مرتضٰی جو کراچی یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے چیئر مین ہوئے۔ یہ ایوب خان کا آخری دور تھا جن کے خلاف طلبہ کی تحریک چل رہی تھی۔ ہم دن میں پولیس سے آنکھ مچولی کھیلتے تھے اور شام کو کام پر دفتر آتے تو اس طرح سر جھکا کر بیٹھتے جیسے کچھ نہیں کیا۔ ایوب خان کی جگہ جنرل یحیٰ خان کا دور آیا تو میں حریت چھوڑ کر مشرق آ گیا تھا۔ 1970ء میں صحافیوں کی ملک گیر ہڑتال ہوئی تھی جس میں دس دن تک کوئی اخبار نہیں چھپ سکا تھا۔ اس لڑائی کا ایک گمنام سپاہی میں بھی تھا اور شہید ہونے والوں میں بھی شامل تھا۔ حکومت نے ہڑتال کچلی تو چن چن کر ملک بھر کے اخباروں سے دو سو صحافی نکالے، میں بھی ان میں سے ایک تھا اور کسی بھی بڑے اخبار میں کام کرنے کے لیے بلیک لسٹ تھا۔ اس زمانے میں صحافیوں نے اپنے اخبار نکالے۔ ارشاد راؤ نے الفتح نکالا جو اپنے زمانے کا مشہور ہفت روزہ تھا میں اس کا اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوا۔ اس کے ایک سال بعد جنگ کے سینئر صحافیوں اجمل دہلوی اور افضل صدیقی نے ڈیلی اخبار نکالا جو بعد میں امن کے نام سے مشہور ہوا، میں اس کا پہلا نیوز ایڈیٹر بنا۔ بھٹو صاحب کی حکومت آئی تو نکالے جانے والے سب صحافی بحال ہوگئے۔ میں بھی مشرق میں واپس آ گیا اور سینئر رپورٹر کے طور پر کام کرنے لگا۔ ان سارے زمانوں میں چھپے ہوئے لفظ کی حرمت برقرار تھی۔ حکام اپنے خلاف لکھے جانے والے لفظ سے ڈرا کرتے تھے۔ اس لیے ڈکٹیٹر فوجی ہوں یا سویلین، اخباروں کی آزادی کا گلا گھوٹنے میں سب ایک سے تھے۔ بھٹو صاحب نے جلد ہی اپنا رنگ نکالا اس کے ساتھ ہی صحافیوں کی انجمن پی ایف یو جے نے بھی ان کے خلاف جہاد کرنے کا اعلان کیا۔ لاہور میں صحافیوں نے اخبارات کے خلاف سیاہ قوانین ختم کرانے کے لیے گرفتاریاں پیش کرنے کی احتجاجی مہم شروع کی۔ کراچی سے لاہور جا کر گرفتاری پیش کرنے والے پہلے گروپ میں میں بھی تھا۔ لاہور کی کیمپ جیل میں ایک مہینے کی قید گزاری۔ ''مشرق'' حکومت کا اخبار تھا لیکن اس زمانے میں صحافیوں کی یونین مضبوط تھی اور میں یونین کا عہدیدار بھی تھا اس لیے ملازمت بچ گئی۔

1974ء میں صحافت کا ڈپلومہ لینے یورپ چلا گیا۔ ملک ملک گھوما اور دیکھا وہاں صحافت کس طرح ہوتی ہے اس لیے چھ ماہ بعد واپس پاکستان آیا تو مشرق میں دل نہیں لگا، استعفیٰ دے کر اپنا ہفت روزہ ''معیار'' نکالا۔ اس میں میرے پارٹنر محمود شام تھے جو آج کل جنگ کے گروپ ایڈیٹر ہیں۔ ایک سال کے اندر اندر ''معیار'' پاکستان کا سب سے ممتاز سیاسی ہفت روزہ بن گیا تھا۔ لیکن پھر وہی ہوا جو اس سے پہلے ہوتا رہا ہے۔ 1977ء میں ضیاء الحق کی فوجی آمریت مسلط ہوگئی۔ ہم نے ایک بار پھر سمجھوتہ کرنے سے انکار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معیار چار بار بند کیا گیا، میرے خلاف حکومت کے تیرہ کیسز تھے۔ 1980ء میں جلاوطنی اختیار کی اور نیویارک چلا گیا۔ تین سال وہاں رہا، یاسمین بحرین یونیورسٹی میں پڑھا رہی تھیں، میں بھی بحرین آ کر وہاں کے ایک اخبار میں کام کرنے لگا۔ چار پانچ سال اسی اخبار میں رہا، وہ بند ہوگیا تو 1987ء میں کویت کے اخبار عرب ٹائمز کے اردو سیکشن کا ایڈیٹر ہوکر وہاں چلا گیا۔ یہ ہے میری صحافیانہ زندگی کی کل کہانی۔ ایک اضافہ یہ ہے کہ آج کل انگریزی اخبار ڈان کا آسٹریلیا کا نمائندہ ہوں۔

- آپ کا کوئی صحافیانہ کارنامہ؟

☆ صحافی کا کام ہے کہ وہ خبر تلاش کرے اور اسے شائع کرے، واقعات کا تجزیہ کرے اور اسے کسی خوف کے بغیر لکھ دے۔ میں اسے کارنامہ نہیں کہتا، اس طرح کے کاموں سے زندگی بھری پڑی ہے۔ مثلاً 1971ء کے آخر میں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جنرل یحییٰ خان کی عیاشیوں کے بارے میں پہلی رپورٹ میری شائع ہوئی تھی اور اسی کے بعد پاکستان کے اخباروں میں ایسی خبروں کی دوڑ شروع ہوئی۔ ''الفتح'' میں میں نے نیوی کی بدعنوانیوں پر ''بحری وڈیرے'' کے نام سے ایک تحقیقاتی رپورٹ شائع کی تھی جس کے خلاف حکومت نے بہت ہنگامہ مچایا تھا۔ ''مشرق'' میں میں نے نجی تعلیمی اداروں کے حالات پر تحقیقاتی رپورٹوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ بھٹو صاحب نے جب تعلیمی اداروں کو نیشنلائز کیا تو ان رپورٹوں کو کتابی صورت میں شائع کر کے اپنے اقدام کے جواز کے طور پر پیش کیا۔ ''معیار'' شروع کیا تو اس نے اردو کی ہفت روزہ صحافت میں ایک نیا معیار اور انداز قائم کیا۔ کویت گیا تو عرب ٹائمز کے مالکان اردو حصے کو تنگ آ کر بند کرنے والے تھے مجھے آخری امید کے طور پر بحرین سے بلایا گیا تھا۔

تین مہینے کے اندر عرب ٹائمز کا اردو اخبار پاکستان کے کسی بھی اچھے سے اچھے اخبار کے برابر رکھا جا سکتا تھا۔

● آپ آسٹریلیا کب اور کیسے آئے؟

☆ 5 جولائی 1989ء کو۔ میں نے پاکستان بھی 5 جولائی کو چھوڑا تھا۔ یہ پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کے تاریک دور کے آغاز کی تاریخ تھی۔ میں کویت میں تھا جب آسٹریلیا کی امیگریشن مل گئی تھی، لیکن ہم شش و پنج میں تھے کہ نئی ہجرت کریں یا نہ کریں۔ وہاں زندگی بہت اچھی تھی۔ مالی اعتبار سے بھی اور صحافتی طور پر بھی، لیکن پھر بچوں کی تعلیم اور بہتر مستقبل کی وجہ سے آنے کا فیصلہ کر لیا۔

● شاعری کی ابتدا کب ہوئی اور اب تک کتنی کتابیں تحریر کی ہیں؟

☆ شاعری کالج کے زمانے کا شوق تھا۔ پاکستان میں صحافتی مصروفیات میں یہ شوق کہیں گم ہو گیا تھا۔ پاکستان چھوڑنے کے بعد اس شوق کو پروان چڑھانے کا موقع ملا۔ شاعری زندگی میں رومانس برقرار رکھتی ہے۔ اس لیے شاعری سے میرا عشق آج بھی جاری ہے۔ شاعری کا پہلا مجموعہ ''نصاب'' 1996ء میں شائع ہوا تھا۔ نیا مجموعہ جلد شائع ہونے والا ہے۔

● ناول نگاری سے کیسے دلچسپی پیدا ہوئی؟ اسے لکھنے کا خیال کیسے آیا؟

☆ ادب کا شوق شروع سے تھا لیکن صحافت ادب کو کھا جاتی ہے۔ صحافتی مصرفیات نے کبھی ادبی مصروفیات شروع کرنے کی مہلت نہیں دی۔ آسٹریلیا میں ایس بی ایس ٹی وی کے لیے ایک سیریز لکھی تھی۔ ''بے وطن'' اسی کی کہانی تھی۔ سیریز نہ بن سکی تو میں نے اس کہانی کی بنیاد پر ناول لکھنا شروع کر دیا۔ یہ میری بے وطنی کی کہانی نہیں ہے۔ لیکن اپنی بے وطنی کے دوران جو واقعات دیکھے اور کہانیاں سنیں انہیں لکھتا گیا۔

● کیا آپ کو ناول لکھنے سے پہلے اس قدر شاندار پذیرائی اور ایوارڈ ملنے کی توقع تھی؟

☆ دیکھئے میں لکھنے کا کام پہلے سے یہ سوچ کر نہیں کرتا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ وہ خبر ہو یا ناول، میں جس طرح سوچتا اور سمجھتا ہوں اسے بیان کر دیتا ہوں، یہ سوچے بغیر کہ اس کے نتیجے میں سزا ملے گی یا جزا۔ لیکن میں نے ناول کو ایک چیلنج سمجھ کر لکھنا شروع کیا تھا۔ اس لیے یقین تھا کہ ناول پسند ضرور کیا جائے گا۔ ایوارڈ ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ پاکستان کے ادبی حلقوں

اور ایوارڈ دینے والے اداروں میں میری کوئی لابی نہیں ہے اور میں پاکستان سے ہزاروں میل دور بھی بیٹھا ہوا ہوں۔ لیکن شاید اتفاق سے ایوارڈ کا فیصلہ کرنے والوں میں احمد ندیم قاسمی، مشتاق احمد یوسفی، شوکت صدیقی، انتظار حسین اور مُشفق خواجہ جیسے بڑے ادیب شامل تھے۔

● ''بے وطن'' میں خال خال اور وزیر اعظم پورے کا پورا سیاسی موضوع پر ہے، سماجی موضوع کو چھوڑ کر پہلی دفعہ آپ نے ناولوں کو سیاسی موضوع دیا، اس کا خیال آپ کو کیسے آیا؟

☆ سیاسی اور سماجی معاملات ایک دوسرے سے نتھی ہیں اور ایک دوسرے پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ وزیر اعظم میں بھی سماجی معاملات ہیں۔ ہنگری والا باب ناول کے اندر ایک علیحدہ ناولٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لاہور میں وزیر اعظم کی تعارفی تقریب میں احمد ندیم قاسمی مہمان خصوصی تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں یہ بات کہی کہ ادیب سیاست کو ادب کا موضوع بناتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ میں نے ادب میں سیاست کو موضوع بنا کر ایک نئی روایت کا آغاز کیا ہے۔ قاسمی صاحب کی یہ محبت ہے کہ انہوں نے اس ضمن میں میری تعریف کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ''اس موضوع کو اشرف شاؔد جیسا پختہ کار صحافی ہی نباہ سکتا ہے۔'' میں ''وزیر اعظم'' کی اشاعت پر پاکستان گیا تو دوستوں نے حیرت ظاہر کی کہ میں نے وزیر اعظم جیسا ناول لکھنے کے بعد بھی پاکستان آنے کی ہمت کیسے کی۔ یہ نواز شریف کا زمانہ تھا جو اس ناول کا ایک کردار بھی تھے۔ پی ٹی وی پر میرا انٹرویو ہونے لگا تو میں نے دوستوں سے کہا کہ وہ انٹرویو نہ کریں، مشکل میں آسکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کرنے والوں کو ناول پڑھنے کی فرصت نہیں ہے، آپ فکر نہ کریں۔ میری کامیابی کی شاید سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ موضوع معاشرتی ہو یا سیاسی میں کسی سے ڈرے اور نتائج کی پرواہ کئے بغیر لکھتا ہوں۔

● مستقبل میں آپ کی کون سی کتاب آ رہی ہے؟

☆ میں ''صدر محترم'' لکھ رہا ہوں جو ''وزیر اعظم'' ہی کے سلسلے کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ناول اب تک چھپ جانا چاہئے تھا، لیکن میں اسے اب تک مکمل نہیں کر سکا۔ مصروفیات اور دنیا کے حالات اس تاخیر کی وجہ ہیں۔ حالانکہ مجھے جلدی کرنا چاہئے، کیونکہ آج کل بہت کچھ اس طرح ہو رہا ہے جو میں صدر محترم میں لکھ چکا ہوں۔ میں نے آپ کو ایک حصہ پڑھ کر بھی سنایا ہے۔

متفرق تحریریں

کتابوں کے پیش لفظ

اشرف شآد

نصاب (۱۹۹۶ء)

نصاب کی اشاعت ایک ایسا ہی غیر ارادی عمل ہے جیسا کہ میرے لیے شعر کہنا۔ فنکاروں اور خاص طور پر ادیبوں اور شعرا کو میں بے حد محترم اور قابلِ عزت سمجھتا ہوں لیکن میں نے باعزت افراد کی اس فہرست میں کبھی اپنا شمار نہیں کیا تھا۔ شعر کہنا وجہِ تسکین اور ایک زمانے میں اظہار کا واحد ذریعہ تھا، لیکن ورق ورق بکھرے ہوئے اس نصابِ جاں کو مجموعہ بنانے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ پاکستان سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر یہ ایک کارِگراں تھا جس کی تکمیل میں بڑا دخل یاسمین کے ارادے کا ہے۔ یاسمین جب کوئی ارادہ کر لیتی ہیں تو اسے پورا ہونا ہی ہوتا ہے۔ نصاب کی اشاعت کا مرحلہ طے بھی اُس زمانے میں ہوا جب زندگی نصف صدی کے سنگِ میل عبور کر رہی ہے۔ اس جادوئی عدد تک پہنچنے کے بعد گزری ہوئی عمر کے گناہ و ثواب سمیٹنے کا خیال بھی نصاب مرتب کرنے کی وجہ بنا ہے۔ نصاب کی شکل میں شاید میں نے خود اپنے آپ کو تحفہ دینے کی کوشش کی ہے۔

اس مجموعے میں شامل تخلیقات بے وطنی کے زمانے کی ہی۔ اکثر غزلیں اور نظمیں حالات کے تناظر میں اور کسی نہ کسی واقعے سے تحریک پا کر کہی گئی ہیں۔ کہیں کہیں یہ حوالہ رقم کر دیا ہے لیکن ہر تخلیق کا تاریخی سبب بیان کرنے کو عیب جانا ہے۔ پاکستان میں رہتے ہوئے قید و بند، زبان بندی اور بے روزگاری کے بہت سے عذاب جھیلے، لیکن وہ جنگ کا زمانہ تھا۔ احساس شعلہ بن کر شعر کہنے پر نہیں عملی قدم اٹھانے پر اکساتا۔ نیویارک میں خودساختہ جلاوطنی کے ابتدائی سالوں میں زخم تازہ

تھے اس لیے خیال کی لَو تیز ہوئی تو سینہ کوبی کی جگہ رات کا سینہ چاک کرنے کی دیوانگی زور مارتی، لیکن بحرین، کویت اور اس کے بعد سڈنی میں زندگی قناعت زدہ ہوکر ساکت ہوگئی۔ احساس کو جب عمل کی راہ میسر نہیں آئی تو شعروں کے دریچے کھلنے لگے۔ مشاعروں اور شعری نشستوں کی بہتات نے خلیجی علاقوں کو شاعری کے لیے بہت زرخیز کردیا ہے۔ اس ماحول نے میری شعرگوئی کے شوق کو بھی تحریک دی۔ مجموعے میں شامل میری غزلیں اور نظمیں انہیں زمانوں کا حاصل ہیں۔ مجھے یقین ہے میرے احباب نصاب میں شامل کلام میں محاسن تلاش کرکے دوستی کا حق ادا کریں گے، اس بارے میں خود میرا کچھ کہنا نامناسب اور بے محل ہوگا۔

بے وطن (پہلا ایڈیشن۔ ۱۹۹۷ء)

مشہور برطانوی ناول نگار جیفری آرچر نے سڈنی میں ایک لنچ کے دوران اپنے سامعین کو بتایا تھا کہ وہ ادب نہیں کہانی لکھتے ہیں۔ آسٹریلیا کے ایک معروف صحافی اور ناول نگار 'کٹ ڈینٹن' (Kit Denton) کو جنہوں نے حال ہی میں وفات پائی ہے، اپنے نام کے ساتھ ادیب اور مصنف کے دم چھلے لگانا پسند نہیں تھا۔ اپنے پہلے ناول کا پیش لفظ لکھتے ہوئے ان دونوں کی یاد اس لیے آئی کہ میں نے بھی یہ ناول ادیب بن کر نہیں کہانی نویس بن کر لکھا ہے۔ زیادہ زور کہانی پر دیا ہے اور کہانی کے عنصر کو مضبوط رکھنے کے لیے کہیں کہیں بیانیہ انداز اور داستان گوئی کے قدیم فن کا سہارا بھی لیا ہے۔ اس طرح کہانی کی دلچسپی برقرار رہی ہے اور روانی میں بھی جھول نہیں آیا ہے۔

ناول کے بیشتر واقعات سچ پر مبنی ہیں جنہیں میں نے افسانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایک مرکزی کردار ہے جس کے ہمراہ بہت سے کردار اور ان کی کہانیاں چل رہی ہیں۔ اس کے باوجود پلاٹ کو گنجلک نہیں ہونے دیا ہے اور کہانی کا تجسس آخری سطر تک قائم رکھا ہے۔ زبان بھی سادہ اور عام فہم استعمال کی ہے، بول چال کے انگریزی الفاظ استعمال کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ شروع کے کسی ایک باب کے علاوہ پورے ناول میں یہ بدعت نہیں ملے گی۔ یہ تمام احتیاطی تدابیر اس لیے کی گئی ہیں کہ ناول کی کشش کسی ایک حلقے تک محدود نہ رہے۔

کچھ دوستوں نے پڑھے بغیر صرف کتاب دیکھتے ہی یہ تنقید کی کہ 'ضخامت زیادہ ہے'

اشارتاً یہ بھی سمجھایا کہ ضخیم ناولوں کا دور اب ختم ہو گیا ہے، لوگوں کے پاس پڑھنے کا وقت رہا ہے نہ عادت۔ لیکن کوئی یہ ضمانت دینے کو تیار نہ تھا کہ صفحات کم ہو جائیں تو کتاب فروخت کے ریکارڈ توڑے گی۔ میں نے برسوں تحریروں کی بے رحمانہ چیر پھاڑ کر کے اپنی روزی کمائی ہے لیکن یوسفی صاحب کے بقول اپنی تحریر کے حشو و زائد نکالنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی سرجن اپنے اپنڈکس کا آپریشن خود کرنے کی کوشش کرے۔ مغرب کی طرح ہمارے یہاں اور خاص طور پر اردو ادب میں کتابوں کی ایڈیٹنگ کا ہنر ابھی پیشہ نہیں بنا ہے۔ اردو کتاب لکھنے والے یہ کام ان ادیب دوستوں سے لیتے ہیں جنہیں وہ اپنے اپنے معیار کے مطابق مناسب اور مستند سمجھتے ہیں۔ ہزاروں میل دور آسٹریلیا میں رہتے ہوئے مجھے یہ سہولت بھی حاصل نہیں تھی۔ پھر بھی لال قلم لے کر جتنا خون ممکن ہو سکا بہایا ہے۔ لیکن اس مار دھاڑ میں مرکزی کرداروں اور ان سے وابستہ کہانیوں کے جسموں پر خراش تک نہیں آنے دی ہے۔

بے وطن (دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۹ء)

کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان غلطیوں کو جو صرف چھپنے کے بعد نظر آتی ہیں، درست کرنے اور 'تحریر کے حشو و زائد' نکالنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کے بعد کئی اور غلطیاں اچانک آنکھوں میں کھٹکنے لگیں گی۔ اس کے باوجود کوشش کی ہے کہ اگر کتاب کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہو تو طابع کو نئے سرے سے پلیٹیں نہ بنانی پڑیں۔

'بے وطن' کو جب ۱۹۹۷ء کے بہترین ناول کا وزیراعظم ادبی ایوارڈ ملا اور ابلاغ عامہ کے ذرائع نے ان کی تشہیر کی تو لوگوں کو ایک غیر معروف مصنف کے انعام یافتہ ناول کو دیکھنے کا تجسس ہوا لیکن کتاب دستیاب نہیں تھی۔ تقسیم اعزازات کی تقریب کے دوران لاہور، پنڈی اور پشاور کے دوستوں نے بھی یہی بتایا کہ انہیں کتابوں کی کسی دکان پر 'بے وطن' دیکھنے کو نہیں ملی۔ میرا خیال ہے کہ کسی نئے مصنف کے پہلے ناول کو تاجرانِ کتب کی توجہ حاصل کرنے میں جس مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے 'بے وطن' بھی اس دشواری کا شکار رہی۔ پہلا ایڈیشن شائع بھی محدود تعداد میں ہوا تھا اور جو کتابیں کراچی والوں سے بچ گئیں وہ کراچی سے آگے جو سمندر ہے اس پار چلی گئیں۔ مجھے یقین

ہے اب دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد کسی کو کتاب کی عدم دستیابی کی شکایت نہیں رہے گی۔

پاکستان آتا ہوں تو شاعر وادیب دوستوں کا یہ گلہ بھی سننے کو ملتا ہے کہ پڑھنے کا رجحان ختم اور کتاب خریدنے والے ناپید ہو گئے ہیں۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ جس جنس کے خریدار نہ ہوں تو اسے فروخت کرنے والے بھی اپنی دکانیں بڑھا دیتے ہیں۔ لیکن بظاہر ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ ناشران و تاجرانِ کتب دھڑا دھڑ دیوالیہ ہو رہے ہوں۔ اس کے برعکس گزشتہ چند برسوں میں اشاعت گھروں کی تعداد میں اضافہ اور ان کے کاروبار کو وسعت ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان میں دوسرے تمام شعبوں کی طرح کتابی بازار بھی نظم کے فقدان کا شکار ہے۔ اکادمی ادبیات، مقتدرہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، انجمن ترقی اردو اور پاکستان بھر کی جامعات کے اشاعت گھر نجی اشاعت گھروں سے مل کر اس نظم کو قائم کرنے میں مدد دے سکتے ہیں اور کتاب گھروں اور مصنفوں کے درمیان ایک ایسا پل بن سکتے ہیں جس کا پبلشروں، کتب فروشوں اور مصنفوں تینوں کو فائدہ ہو۔

'بے وطن' کو میرے دوست احمد شمسی نے جو میرے بڑے بھائی کی طرح تھے، شائع کیا تھا۔ وہ اچانک اور عین اس دن انتقال کر گئے جس دن میں 'بے وطن' کے لیے ایوارڈ لینے پاکستان پہنچا تھا۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت تھے جنہوں نے ایک طرف آئینہ، زندگی اور بندش جیسی کامیاب فلمیں بنائیں تو دوسری طرف سری لنکا سے آنکھوں کے عطیے منگا کر ہزاروں بے نور آنکھوں میں چراغ روشن کرنے والے ادارے پاکستان آئی بینک سوسائٹی کو ایک مضبوط مالی اور انتظامی بنیاد فراہم کی۔ وہ صوابی جا کر سرحد میں غلاموں کو آزاد کرانے کی جدوجہد کو بھی مالی اور اخلاقی معاونت دیتے رہے۔ انہوں نے میرا شعری مجموعہ 'نصاب' اور ناول 'بے وطن' شائع کرنے کے لیے پبلشر کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

وزیراعظم (۲۰۰۰ء)

پاکستان میں سیاسی منظر نامہ اس تیزی سے بدلتا ہے کہ آج کی کہانی آج لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ 'وزیراعظم' لکھنے کے دوران دو وزیراعظم بدل چکے ہیں اور کوئی نئی تبدیلی آئی تو آج کی یہ کہانی گزرے ہوئے کل کی کہانی بن جائے گی۔ لیکن آج کے پاکستان کی یہ کہانی سیاسی تاریخ لکھنے کی

کوشش نہیں ہے، اس لیے اسے پڑھتے ہوئے تاریخ کی غلطیاں نہ نکالی جائیں۔ دراصل یہ سیاسی ناول ہے بھی نہیں۔ اس کی کہانی نے انسانی رشتوں کی نزاکتوں کو ساتھ لے کر روایتی ناول کے اتار چڑھاؤ طے کیے اور بہت سے جذباتی موڑ کاٹے ہیں۔ اس کے کردار عشق و محبت کا کھیل بھی کھیلتے ہیں لیکن یہ کردار کیونکہ سیاست کے کاروبار سے بھی وابستہ ہیں اس لیے دوستیاں اور رشتے نباہنے اور عشق و محبت کا کھیل کھیلنے کا ان کا اپنا ایک الگ انداز ہے۔ یہ انداز آپ کو پسند آئے یا نہ آئے قدم قدم پر آپ کو حیران ضرور کردے گا۔

میرا پہلا ناول 'بے وطن' شائع ہوا تو کہا گیا تھا کہ بقول میراجی ایک ناول ہر شخص کے اندر ہوتا ہے، وہ باہر آ گیا ہے۔ گزشتہ سال جب 'وزیراعظم' طباعت کے لیے تیار ہوکر پاکستان پہنچا تو دوستوں نے آسٹریلیا کی اس پُرسکون فضا کو سراہا جہاں بیٹھ کر فی برس ایک ضخیم ناول لکھنا آسان ہے۔ یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ آسٹریلیا کی نیلی اور برفانی پہاڑیوں اور جھیلوں سے مزین سرسبز وادیوں میں گہرا سکون اور اطمینان ہے۔ بہت سے جنت نشان مقام ایسے ہیں جو مجھ جیسے عام انسان کی بھی پہنچ اور دسترس میں ہیں، لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں لفظوں کی نقاشی اور ان کی مرمت کا کام خاموش فضاؤں میں بیٹھ کر نہیں کرسکتا۔ گزشتہ چھ برسوں سے میری تخلیقی سرگرمیوں کا مسکن یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز کا وہ کیفے ہے جو نوعمر طالبانِ علم سے بھرا ہوتا ہے اور جہاں باتوں، نعروں، قہقہوں اور سسکاریوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ 'بے وطن' میں کیفے ایسمیس کا بار بار تذکرہ آیا ہے جہاں بیٹھ کر میں نے ایک تحقیقی مقالہ اور اپنے دونوں ناول تحریر کیے ہیں۔ یہ کیفے یونیورسٹی کی چودہ منزلہ لائبریری کے بالکل سامنے واقع ہے جس کی وجہ سے تحقیقی کتب تک رسائی آسان رہتی ہے۔ ناول میں دیے گئے ایک ایک حوالے کی صحت جانچنے کے لیے کئی کئی کتابیں نچوڑی ہیں، وہیں بیٹھ کر نوکرشاہی کی پوری تاریخ کھنگالی ہے اور مقامات کا جغرافیہ درست رکھنے کے لیے بھی اکثر اسی کتب خانے کی مدد لی ہے، لیکن یہ خیال رکھا ہے کہ تحقیق کا بہاؤ ناول کی سمت تبدیل کر کے اسے گراں نہ کردے۔

'وزیراعظم' کا مرکزی کردار ایک صحافی ہے اس لیے اکثر دوست اس میں میرا چہرہ دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ 'بے وطن' کو بھی صرف اس کے نام کی وجہ سے پڑھے بغیر میرا سوانحی ناول کہہ دیا گیا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب میں نے بے وطنی کے عذاب جھیلے تھے لیکن 'بے وطن' میری

کہانی نہیں تھی۔ اسی طرح 'وزیراعظم' کا ذہین جلالی بھی میں نہیں ہوں۔ میں نے کہانیوں کو ان کے اندر اور کبھی باہر بیٹھ کر دیکھا سنا اور بیان کیا ہے لیکن خود کو کہانی نہیں بنایا۔ لہٰذا 'وزیراعظم' کو آپ بیتی یا بقول یوسفی صاحب 'پاپ بیتی' سمجھنے کے بجائے ایک ناول اور ایک افسانوی تخلیق سمجھ کر پڑھیے اور جیسا کہ میں نے کتاب کے آغاز میں لکھ دیا ہے، کوئی واقعہ یا کردار سچا لگنے لگے تو اسے اتفاق یا مصنف کی تخلیقی کوششوں کا کمال سمجھئے گا۔

آ مرے قریب آ (۲۰۰۳ء)

میں اپنے مجموعے کا نام 'حرفِ رفوگر' رکھنا چاہتا تھا، لیکن دوستوں نے کہا اب اضافت والے مشکل ناموں کا رواج نہیں رہا۔ میں نے مجموعے کا نام بدل کر پرانا سوچا ہوا نام پیش لفظ کو دے دیا ہے۔ 'آ مرے قریب آ' میری سب سے تازہ غزل کی ردیف ہے۔ یہ نام بھی کچھ دوستوں کو پسند آیا اور کچھ کو نہیں۔ شاید اس بحث میں کتاب بے نام رہ جاتی اس لیے میں نے اسے اپنی خواہشوں سے موسوم رہنے دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کسی نہ کسی حوالے سے یہ خواہش پڑھنے والوں کے دلوں میں بھی دھڑکتی ہوگی۔

نئی کتاب میں میرے پہلے مجموعے 'نصاب' کی کچھ منتخب غزلیں اور نظمیں بھی شامل ہیں۔ 'نصاب' میری بے وطنی کے ادوار میں منقسم تھا۔ بے وطنی کا دور ختم ہو کر اب دربدری کا نیا دور شروع ہوا ہے تو شعر نازل ہونے کے مقام کا تعین مشکل ہو گیا ہے۔ کئی غزلیں دورانِ پرواز وارد ہوئیں، کچھ نیوکیسل آتے جاتے ٹرین کا، یا شہر در شہر بس کا سفر کرتے یا سڈنی کی سڑکوں پر پیدل چلتے ہوئے۔ کیا خیال کہاں آیا، کس زمین پر، کہاں عمارت مکمل ہوئی، یہ تلاش مشکل ہے۔ میں نے کبھی ایک جگہ بیٹھ کر شعر کہا بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے میری غزلوں میں پانچ سات سے زیادہ شعر نہیں ہوتے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں بھرتی کے شعر نکال دیتا ہوں۔ میں نے یہ کام اپنے سخن شناس دوستوں پر نہیں چھوڑا، ورنہ کسی غزل میں کوئی شعر نہ بچتا۔

میں آج کل العین میں مقیم ہوں جہاں ٹرام اور بس کے ساتھ ٹرین کا سفر بھی موقوف ہے، اس لیے شاعری بھی ٹھہر گئی ہے۔ ویسے بھی میری تمام تر توجہ اپنا تیسرا ناول 'صدرِ محترم' مکمل کرنے پر مرکوز ہے۔ 'آ مرے قریب آ' میری صحافت اور ناول نگاری سے اُدھار لیا ہوا ایک وقفہ ہے، ہوا کا

ایک ٹھنڈا جھونکا، خوشبوؤں کا جزیرہ، ایک بھولا ہوا سپنا۔ شاعری پہلی محبت کی طرح ہوتی ہے جو ناکام ہوکر بھی عمر بھر کسک دیتی رہتی ہے۔ یہ خواب دیکھنے کا عمل ہے جو نظر نہ آئیں تو زندگی بے رنگ ہو جاتی ہے۔

میں اسی لیے صحافت اور ناول نگاری کی طرح شاعری پر دعویٰ نہیں کرتا۔ میرے شاعر دوست اس بات پر بہت برہم ہو کر کہتے ہیں 'تم نے کتاب چھاپ کر دعویٰ کر دیا ہے۔' ان کی ناراضی سر آنکھوں پر، لیکن شاعری میرا رومانس ہے۔ میں اس پر دعویٰ نہیں کر سکتا۔ شاعری کا نازک آبگینہ دعووں کی سخت گیری کا متحمل ہو بھی نہیں سکتا۔ مجھے ہلکے سُروں میں گنگنانا اچھا لگتا ہے۔ یہ مجموعہ میری یہی گنگناہٹ ہے۔

صدرِ محترم (۲۰۰۴ء)

جب 'وزیر اعظم' اشاعت کے مراحل طے کر رہا تھا تو نئے ناول کا ابتدائی خاکہ، پلاٹ، کرداروں کا انتخاب اور ابواب کی تقسیم تک مکمل ہو گئی تھی، اسی لیے 'وزیر اعظم' میں یہ نوید دی گئی تھی کہ 'صدرِ محترم' ۲۰۰۰ء میں منظرِ عام پر آجائے گا۔ بہت سے دوست بازار میں تلاش کرتے رہے۔ 'دوست' والے بھی مایوس ہونے لگے تھے۔ 'لوگوں نے اب پوچھنا چھوڑ دیا ہے' آصف محمود نے پچھلے سال مجھے بتایا تھا۔ مجھے پتا ہے مارکیٹنگ کے اعتبار سے یہ اچھی خبر نہیں ہے۔ ہم ویسے بھی بھول جانے والے لوگ ہیں، لیکن تخلیقی کام بھی مشینی عمل یا ٹائم ٹیبل کا پابند نہیں ہوتا۔ 'صدرِ محترم' لکھنے میں دو کی جگہ چار سال لگ گئے اور کتاب کے بازار میں آتے آتے شاید ۲۰۰۴ء آجائے۔

کئی وجوہات تھیں۔ کچھ روزگار کی مصروفیات تھیں، حالاتِ زمانہ بھی سازگار نہیں تھے۔ 'وزیر اعظم' لکھنے کے دوران تین وزرائے اعظم بدلے تھے، 'صدرِ محترم' لکھتے ہوئے وزارتِ عظمٰی کے پورے ادارے ہی کی بساط الٹ گئی۔ اس وقت ایک دوست نے مشورہ دیا تھا کہ نام بدل کر 'چیف ایگزیکٹو' رکھ دیا جائے، لیکن میں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، مجھے کتاب کا نام تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

نام تبدیل کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ 'صدرِ محترم' محض ایک فینٹسی ہے، کسی سچ مچ کے کردار کو سامنے رکھ کر نہیں لکھی گئی...... یہ سبق میں نے 'وزیر اعظم' سے سیکھا تھا۔ کہانی وزیر اعظم

کی بھی افسانوی تھی، لیکن کئی کردار پاکستان کی سیاست سے لیے گئے تھے۔ اکثر قاری فرضی ناموں کے پیچھے چھپے ہوئے اصلی کرداروں کی تلاش میں کھو گئے۔ ان کرداروں میں بھی کسی نہ کسی کی شباہت تلاش کر لی گئی جو واقعی فرضی تھے۔ 'وزیر اعظم' کے برعکس میں نے 'صدرِ محترم' میں یہ احتیاط رکھی ہے کہ کوئی کردار اتفاقاً بھی حقیقی نہ نظر آئے۔

'صدرِ محترم' ایک مختلف طرح کا فکشن ہے۔ یہ ایک سپنا ہے۔ میں نے یہ خواب 'وزیر اعظم' لکھتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اسے اس میں سمو نہ سکا تھا اسی لیے 'وزیر اعظم' اپنے انجام دکے اعتبار سے ایک نامکمل ناول تھا۔ 'صدرِ محترم' میں اس کی تکمیل ہوئی ہے۔ ایک ایسا صدر برسرِ اقتدار آیا ہے جو ملک کی کایا پلٹ کر اسے 'نیا پاکستان' بنا دیتا ہے۔ یہ مستقبل کی کہانی ہے۔ 'وزیر اعظم' زمانۂ حال کی کہانی تھی۔ وہ حال جو ماضی ہی کا حصہ تھا اور جس کے آئینے میں مستقبل دیکھنا مشکل تھا۔ میں نے یہ مستقبل 'صدرِ محترم' میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، لیکن گزشتہ دو تین برسوں سے زمین اتنی تیزی سے گردش کر رہی ہے کہ مستقبل نزدیک آ کر پھر دور چلا جاتا ہے۔

پاکستان میں جب حالیہ فوجی انقلاب آیا تھا اس وقت میں 'نیا پاکستان' والا باب لکھ چکا تھا۔ میں نے سڈنی میں ایک ایڈیٹر دوست کو گواہ بنا کر اس کے اقتباسات سنائے تھے۔ کئی چیزیں اسی طرح ہو رہی تھیں جیسے لکھی گئی تھیں۔ لیکن پھر سب کچھ آتے جاتے موسموں کا کھیل بن گیا۔ کئی بار یہ بھی ہوا کہ دنیا اس مقام پر آتے آتے رک گئی جو 'صدرِ محترم' کی کہانی کا اختتام ہے اور میں کانپ کانپ گیا کہ کہیں واقعی ایسا نہ ہو جائے۔ اس ناول کے آخری دو باب لکھتے ہوئے میں نے اپنی تمام عقیدتوں کو جمع کر کے یہ دعا کی تھی کہ میری کہانی کا انجام سچ ثابت نہ ہو...... میرا یہ ناول محض ایک فینٹسی ہی نہیں، امن کی شدید خواہش کا اظہار بھی ہے۔

پاکستان میں میرے پچھلے دونوں ناولوں 'بے وطن' اور 'وزیر اعظم' کے بارے میں کافی کچھ لکھا گیا۔ کچھ اچھا لکھا گیا ہوگا اور شاید کچھ اچھا نہ بھی لکھا گیا ہو۔ لیکن میں جہاں رہتا ہوں وہاں تک ان تمام چیزوں کی رسائی نہیں ہے اس لیے میرا ذہنی سکون اور اطمینان قائم ہے۔ بے خبری ایک نعمت ہے اور میں اس نعمت سے مالا مال ہوں۔ میری ایک الگ دنیا ہے جہاں میں زنگ آلودہ زنجیروں اور روایتی قیود سے آزاد ہو کر اور کسی تنقید نگار کو نہیں، قاری کو سامنے رکھ کر لکھتا ہوں اور اسی سے داد کا طلب گار بھی ہوں۔

پہلی لکیر (۲۰۱۱ء)

مجھے نہیں معلوم کہ مجھے افسانے لکھنے چاہیے تھے یا نہیں۔ مجھے امید ہے کہ قارئین کہانیوں کا یہ مجموعہ پڑھ کر اس سلسلے میں میری رہنمائی کر سکیں گے۔ میرا اپنا خیال یہی تھا کہ ناول کے کھونٹے سے بندھا رہوں، لیکن کچھ کہانیاں دماغ میں گھر کیے بیٹھی تھیں، انہیں باہر کی ہوا کھلانی تھی۔ کچھ اب بھی ان لکھی رہ گئی ہیں، زندگی رہی تو آئندہ!

کہانیاں لکھنے کا موقع اس لیے بھی مل گیا کہ میں 'جج صاحب' لکھنے کا ارادہ ملتوی کر چکا تھا۔ ۲۰۰۴ء میں صدرِ محترم کی اشاعت کے موقع پر بہت زور شور سے اپنے آئندہ ناول کا اعلان کیا تھا۔ ریسرچ مکمل ہو گئی تھی، پلاٹ ترتیب دے دیا گیا تھا، کردار ڈھونڈ لیے تھے، بحرالکاہل کے اس جزیرے میں بھی وقت گزار آیا تھا جس کے پس منظر میں یہ ناول لکھا جاتا تھا، لیکن پھر پاکستان میں عدلیہ کی بحالی کا معاملہ چل پڑا (بلکہ اب تک چل رہا ہے) اور مجھے یہ ڈر دامن گیر ہوا کہ قاری 'جج صاحب' کے کرداروں میں پاکستان کی سپریم کورٹ کے چہرے نہ تلاش کرنے لگیں گے۔ میرے یہ اوہام اب بھی تازہ ہیں اور گرد بھی ابھی تھمی یا چھٹی نہیں ہے، اسی لیے مناسب یہی سمجھا ہے کہ انتظار کیا جائے۔ انتظار طویل ہوا تو شاید آپ کو کہانیوں اور افسانوں کا ایک اور مجموعہ برداشت کرنا پڑے۔

ناول نگاری ویسے بھی یکسوئی چاہتی ہے، ضروری ہوتا ہے کہ قدم ایک جگہ گڑے ہوں۔ آسٹریلیا میں تھا تو یہ اطمینان حاصل تھا، اس لیے کم عرصے میں پانچ چھ کتابیں کل آئیں۔ العین میں پچھلے سات آٹھ برسوں کا قیام آرام دہ تو بہت تھا لیکن یکسوئی نہیں تھی اور زندگی آسٹریلیا، امارات اور پاکستان کے درمیان بٹی ہوئی تھی۔ اپنا خیمہ اکھاڑ کر اب برونائی لے آیا ہوں، یہاں جم کر بیٹھا رہا تو امید ہے کہ 'جج صاحب' یا کوئی نیا ناول لکھا جا سکے اور اشاعتی مراحل طے کر کے آپ کے ہاتھوں تک پہنچ جائے۔

افسانوں کے اس مجموعے میں شامل صرف دو تین کہانیاں ایسی ہیں جو محترم افتخار امام صدیقی نے 'شاعر' میں شائع کی تھیں، باقی سب طبع زاد ہیں، موضوعات بھی الگ الگ ہیں۔ 'آپ کہاں سے ہیں؟' میں ایک نئے وطن میں آ بسنے والوں کے شناخت کے مسئلے کو مختلف انداز میں برتا گیا ہے۔ 'عمر کا حساب' بھی آسٹریلیا کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی ہے۔ 'چوتھا کھلاڑی' اور تاریخ کا

سبق' سیاسی کہانیاں ہیں جو بقول ایک بزرگ دوست، ناول جیسے بڑے کینوس پر لکھی گئی ہیں۔ 'ایک کہانی غربت کی' بھی افسانے کے کینوس سے ذرا باہر نکل آئی ہے۔ 'پہلی لکیر' حاجی گونگے شاہ کی کہانی ہے لیکن نوعیت اس کی بھی سیاسی ہے۔ لپ اسٹک ایک مختلف طرح کی کہانی ہے جسے ادب کی ایک بہت معتبر شخصیت نے پڑھ کر پسند فرمایا تھا لیکن اس کے انجام کو فحش قرار دیا تھا۔ 'بدلتے زمانے' اسی تبصرے کا ردِعمل ہے۔ 'شکیلہ' نسبتاً پرانی کہانی ہے جو تقریباً بیس سال پہلے سڈنی کی ایک ادبی محفل کے لیے تھائی لینڈ کے پس منظر میں لکھی گئی تھی۔

میں سفرنامے نہیں لکھتا۔ جن ملکوں میں رہا ہوں ان کے تجربے کہانی بنا کر ناولوں میں بیان کر دیتا ہوں۔ 'بے وطن' میں آسٹریلیا، بحرین اور کویت میں گزرے ہوئے ماہ و سال تھے، 'وزیراعظم' میں ہنگری کے شہر بڈاپسٹ کی سیر تھی اور 'صدرِ محترم' میں نیویارک میں گزرا ہوا زمانہ یاد آیا تھا۔ میں اب الگ الگ 'سفرکہانی' یا 'سفرانے' لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں، یعنی مقامات حقیقی اور کردار اور واقعات افسانوی، اس مجموعے میں شامل 'کاش' ترکی کے سفر کی ایسی ہی ایک کہانی ہے۔ 'سفرانوں' کے لیے ایتھوپیا، سری لنکا، فیجی، نیپال اور صباح (ملائیشیا) کا سفر بھی کیا تھا۔ کہانیاں بھی تیار ہیں لیکن اب تک لکھی نہیں جا سکی ہیں۔ شاید اگلے کسی مجموعے میں شامل ہوں۔ متحدہ عرب امارات کے قیام کے دوران سوچی گئی کئی کڑوی اور میٹھی کہانیاں بھی ایسے ہی کسی مجموعے کا حصہ ہوں گی۔

نئی دہلی میں چند روز

اشرف شاد

نئی دہلی کی گرم دوپہر میں سڑک پر بچھا ہوا کولتار نرم پڑ گیا تھا اور ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں میں بیٹھنے والوں کے ماتھوں پر بھی پسینے کے دانے اُگ آئے تھے،لیکن فٹ پاتھوں کی رونق اسی طرح تھی، اس کے مکیں سورج کے قہر سے بے نیاز اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے۔سڑکوں پر بھی ہر طرح کی انسانی، مشینی اور جانوروں والی سواریوں کا سیلاب رواں دواں تھا۔میں آسٹریلیا کے سرد موسم میں ٹھٹھر کر آ رہا تھا اس لیے موسم کچھ زیادہ ہی گرم لگ رہا تھا۔سڈنی میں دوستوں نے سمجھایا تھا اور اچھے موسم کا انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔وقت اور موسم، کسی کے آنے جانے کا انتظار نہیں کرتے۔ اسی طرح مجھے بھی مصروفیات کو موسموں کے تابع کرنا پسند نہیں تھا۔لیکن جامع مسجد کے پاس ٹریفک میں بہت دیر تک پھنسے رہنے اور پرانی دلّی کے تنگ بازار، پھاٹک حبش خان یا چمن واڑہ کی پتلی پتلی، پیچ در پیچ گلیوں میں اپنے کندھے کو ہر طرح کے کندھے سے رگڑنے کے بعد دوستوں کا مشورہ نہ ماننے کی پشیمانی ہوئی۔بہت برسوں بعد کھانے کے لیے اتنی مشقت کرنی اور اتنا پسینہ بہانا پڑا تھا،اس لیے دوپہر کی ضیافت کا صحیح مزا بھی آیا۔

میں نئی دہلی کے بالکل وسط میں، کناٹ پیلس کے پاس اشوکا روڈ پر بلیوٹرائی اینگل نامی ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔اشوکا روڈ پر چند پھیرے لگائے تو پتا چلا کہ بھارتی سیاست کی نبض اسی شاہراہ پر دھڑکتی ہے۔تمام بڑی سیاسی جماعتوں کے مرکزی دفاتر اسی سڑک پر تھے۔بی جے پی، کانگریس، جنتا دل، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا، آل انڈیا کسان لیگ وغیرہ۔میرا خیال تھا کہ آج کل بی جے پی کی

حکمرانی ہے، اس لیے اس کے دفتر پر جیالوں کا ہجوم ہوگا، لیکن اس در سے کئی بار گزر کے دیکھا، پرانی طرز کی بڑی سی حویلی بھوت بنگلے کی طرح خاموش نظر آئی۔ایک صحافی دوست نے بتایا آج کل پارلیمنٹ کا اجلاس جاری ہے، رش وہاں ہو رہا ہے۔

ایک بڑے دائرے سے اشوکا روڈ کا موڑ کاٹتے ہی سامنے ایک پرشکوہ عمارت حیدرآباد ہاؤس کی ہے۔ اس کی شان وشوکت ابھی تک قائم ہے اور بھارت کا دورہ کرنے والے اہم سرکاری مہمان یہیں ٹھہرائے جاتے ہیں۔ اسی شاہراہ پر سکھوں کا ایک بڑا گوردوارہ بنگلہ صاحب ہے، جس کے سنہری گنبد مجھے اپنے کمرے کی کھڑکی سے نظر آتے تھے۔ سرجیت سنگھ بتا رہے تھے کہ ہزاروں افراد روزانہ یہاں کے لنگر سے کھانا کھاتے ہیں، لنگر کھانے والوں کا سکھ ہونا ضروری نہیں ہے۔ صرف آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ سرجیت ایک بزرگ اور کہنہ مشق لکھنے والے ہیں۔ وہ اردو، ہندی اور پنجابی تینوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور تینوں زبانوں کی نوّے سے زائد کتابوں کا ایک سے دوسری زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں پاکستان میں اردو کی جو بھی کتاب چھپتی ہے وہ دوسرے ہی ہفتے ان کے پاس موجود ہوتی ہے، میں نے لائبریری کے علاوہ کسی ایک کمرے میں اتنی کتابیں ایک ساتھ جمع نہیں دیکھیں۔ زمین سے چھت تک کتابوں کی دورویہ قطاریں لگی ہیں۔ کسی مصنف کا نام لو وہ اس کی کتاب باہر کھینچنے لگتے ہیں، مجھے یہ ڈر تھا کہ کتابوں کا یہ مینار ابھی سر پر آ گرے گا۔ سرجیت جی کو یہ پریشانی ہے کہ ان کے بعد ان کی کتابوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ ''بے وطن'' کو ہندی کا جامہ بھی انہوں نے ہی پہنایا ہے اور اب ''وزیر اعظم'' کا ترجمہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ میں اپنے ناول ''بے وطن'' کے ہندی ایڈیشن کی تقریب رونمائی کے سلسلے میں ہی دہلی آیا تھا۔

میرے پبلشر راج کمل پرکاشن نے جو دعوت نامے چھپوائے تھے، ان میں میرے آسٹریلیا میں قیام کا کوئی تذکرہ نہیں تھا، حوالہ صرف پاکستانی ادیب کا تھا، راج کمل کے پی آر کنسلٹنٹ نے بتایا کہ ہندوستان میں پاکستانی ادیب کی مارکیٹ زیادہ ہے۔ میرا اعتماد اچانک بڑھ گیا۔ اندیشوں اور وسوسوں کی جگہ فخر کے احساس نے لے لی۔ تقریب میں آنے اور اپنے اردگرد جمع ہونے والوں کو دیکھا تو یہ احساس اور بڑھا۔ جوگندر پال جنہیں ''بے وطن'' اور ''وزیر اعظم'' چند روز پہلے ہی ملی تھیں، مجھ سے کہہ رہے تھے ''میں دو دن سے آپ کے ساتھ رہ رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نامور سنگھ یہ بتا کر

حیرت زدہ کر رہے تھے کہ ہندی زبان میں بے وطنی کے موضوع پر نہ ہونے کے برابر لکھا گیا ہے۔ شاداب ردولوی چہروں کو نام دے رہے تھے۔ شمع زیدی جو ٹی وی کا نیا اردو چینل شروع کرنے والوں میں شامل ہیں، راجندر یادیو جو منشی پریم چند کے رسالے ہنس کا اجراء کر رہے ہیں، ہندی کی مشہور کہانی کار چترا موگل۔ افسانہ نگار اصغر وجاہت جو ''وزیر اعظم'' میں ہنگری والا باب پڑھ چکے تھے، بڈاپسٹ میں گزارے ہوئے مہ وسال کا تذکرہ کرنے لگے۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن کے پروفیسر شری واستو کو میں کئی سال سے جانتا ہوں، وہ کسی نہ کسی کانفرنس میں شرکت کرنے آسٹریلیا آتے رہتے ہیں۔ میں بھی چند سال پہلے ان کے انسٹی ٹیوٹ میں سیمینار میں شرکت کے بہانے پہلی بار نئی دہلی آیا تھا۔ وہ اپنے ڈپارٹمنٹ کے چاروں پروفیسروں کے ساتھ تقریب میں آئے تھے اور ہندوستان کی آزادی کے بارے میں اپنی پرانی تھیوری کا حوالہ دے کر بار بار بحث میں گھسیٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں تقریب شروع ہونے سے پہلے کے تناؤ کا شکار تھا، اس لیے دامن بچا رہا تھا، لیکن ایک رات پہلے دہلی پریس کلب کے ڈنر میں جان نہیں بچا پایا تھا اور کئی سینئر صحافیوں کے نرغے میں گھرا کشمیر کی جنگ لڑتا رہا تھا۔ ان سب سے میں نے رسماً دوسرے روز ہونے والی اپنی کتاب کی تقریب کا تذکرہ کیا تھا۔ سب نے تکلفاً اثبات میں گردن ہلائی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اپنی ہاں کو سچ ثابت کرنے وہ سب تقریب میں شریک تھے۔

انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، جہاں ''بے وطن'' کی تقریب ہوئی تھی، نئی دہلی میں ہونے والی سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس کے کئی ونگز اور الگ الگ سبزہ زار ہیں۔ ایک کلب بھی ہے، جہاں اراکین کے لیے رہائشی انتظامات بھی ہیں۔ تقریب کے بعد اسی کلب میں ریاض پنجابی نے ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ ریاض پنجابی کشمیری مسلمان ہیں۔ ادیب اور دانشور ہیں اور سیاسی حلقوں میں بھی احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی بیگم اردو کی ایک اچھی شاعرہ ہیں۔ ریاض پنجابی کشمیر کے پالیسی سازوں میں بھی شامل ہیں، اس لیے ان سے گفتگو اور بھی اہم تھی۔ کشمیر کے علاوہ پاکستان کی جمہوریت بھی زیر بحث تھی مجھے اچانک لگا میں غیر ارادی طور پر فوجی حکمرانی کا دفاع کرنے لگا ہوں۔ لوٹ کر آیا تو دیر تک میرے اندر بحث جاری رہی۔ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔

دہلی پریس کلب میں کئی لنچ اور ڈنر ہوئے۔ یہاں بھی وہی گفتگو، وہی مباحث، میرا دفاع کمزور ہوا تو میں نے جارحانہ حکمت عملی اختیار کی۔ میں بھارت کی جمہوریت پر فخر کرنے والوں سے پوچھ رہا تھا، اس جمہوریت نے پیٹ کیوں نہیں بھرے۔ تن کیوں نہیں ڈھانپے۔ میں پوچھ رہا تھا، بھارت میں پاکستان کے ایک بدعنوان وزیراعظم کے لیے اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ سب بیک زبان اپنا دفاع کر رہے تھے کہ ہمدردی نواز شریف سے نہیں، جمہوریت سے ہے۔ جمہوریت؟ میرے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی، لیکن اندر ہی اندر ہنسی پھوٹنے لگی۔

دہلی پریس کلب نئی دہلی کے مرکز میں ہے۔ میں نے دوپہر، شام، ڈنر کے وقت اور اس کے بعد رات گئے تک اسے ہمیشہ بھرا ہوا دیکھا۔ اس کا کھانا اور مے خانہ دونوں بہت مقبول ہیں۔ راہول جلالی یہاں کے سرگرم ارکان میں سے ہیں۔ وہ مجھے کلب کے صدر سے متعارف کروا رہے تھے۔ راہول جلالی دستاویزی فلمیں بناتے ہیں اور باہر کے ریڈیو اور اخبارات کے لیے فری لانسنگ کرتے ہیں۔ وہ کئی سال آسٹریلیا میں رہے ہیں، جہاں وہ کینبرا ٹائمز کے لیے کام کرتے تھے لیکن اب مستقلاً نئی دہلی واپس آ گئے ہیں۔ کلب میں ایک میز پر ان کا اور دوسری میز پر ان کے والد کا مورچہ لگا ہوتا ہے، جو خود بھی ایک سینئر صحافی ہیں اور اب ریٹائر ہو کر کسی تھنک ٹینک سے وابستہ ہیں۔ وہ کشمیر میں ٹریڈ یونین منظم کرنے والے ابتدائی لوگوں میں سے ہیں۔ وہ اچھے زمانوں کا ذکر کرنے لگے، جب پیٹ خالی ہوتا تھا، لیکن جذبے توانائی سے بھرپور اور آنکھیں امید کی چمک سے روشن ہوتی تھیں۔ ان سے باتیں کر کے بہت اچھا لگا۔

واپسی سے ایک رات پہلے دہلی پریس کلب کے طعام اور مباحث کا منظر منتقل ہو کر ایک گھر کے ڈرائنگ روم کے وسیع کینوس پر پھیل گیا۔ راہول نے الوداعی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ مختلف شعبوں کے چیدہ چیدہ لوگ جمع تھے۔ زی نیوز اور مختلف ملکی و غیر ملکی اخباروں کے نمائندے، ایک ماہر معیشت جو عالمی بینک سے وابستہ رہ چکے تھے۔ انکم ٹیکس کے ایک افسر، دستاویزی فلمیں بنانے والے، ٹی وی کے لیے سیریل بنانے والی ایک پروڈیوسر، کانگریس پارٹی کے انفارمیشن سیل کے ایک رکن۔ یہ ترقی پسندوں کی محفل تھی۔ سب جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے تھے۔ یہاں بی جے پی والوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ یوپی سے منتخب ہونے والے ایک جواں سال رکن اسمبلی بھی تھے۔ نوک پلک سے درست، سیاستدانوں کی بہت اسمارٹ اور کلف لگی یونیفارم، کرتہ، پاجامہ

اور واسکٹ پہنے ہوئے تھے۔ بہت اہم نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن زیادہ توجہ حاصل نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ مجھے اپنی تقریر سنانے لگے جو وہ اسی روز پارلیمنٹ میں کر کے آئے تھے۔ اسی وقت ایک مہمان نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

انہیں کسی نے یہ بتا دیا تھا کہ میں شاعر بھی ہوں۔ وہ مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے جا کر اپنی وہ غزل سنانا چاہتے تھے جو انہوں نے آج تک کسی کو نہیں سنائی تھی۔ رکن پارلیمنٹ کچھ دیر تک کھانے کی میز پر کھڑے مصروف رہے، اس کے بعد کسی شدید مصروفیت کا عذر کر کے خاموشی سے چلے گئے۔

کارگل کا محاذ یہاں بھی گرم تھا۔ جنگ بندی ہو چکی تھی، لیکن جھڑپیں ابھی جاری تھیں۔ میں اپنی فوج کا اکیلا سپاہی تھا جو مورچے پر قدم جمائے کھڑا تھا۔ امن کی بات چیت بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ایک مہمان ایک انگریزی اخبار میں چھپنے والے اداریئے کا ذکر کرنے لگے، جس میں دونوں ملکوں کے درمیان امن دستوں کے تبادلوں کا ذکر کرتے ہوئے سوال کیا گیا تھا کہ جب امن و آشتی اور محبت کی گفتگو کے بعد، دونوں طرف سے ''کشمیر ہمارا ہے'' کے نعرے لگتے ہیں تو پھر امن کی اس قوالی کا فائدہ کیا ہے۔ ایک بنگالی جوڑا ہیمنت کمار کا ایک پرانا گیت گانے لگا تھا۔ ان کے گرد مہمان جمع ہو کر ان کا ساتھ دینے لگے تھے۔ وہ ماہر اقتصادیات جو کافی دیر سے معیشت کی گتھیاں سلجھا رہے تھے، مجھے الگ لے جا کر فیض کو سنانے لگے۔ میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ مجھے فیض کا کلام اتنا یاد نہیں تھا۔ وہ فیض صاحب کی طویل نظمیں بہت روانی سے اٹکے بغیر سنا رہے تھے۔ آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ مسکراہٹ بھی پھیل گئی تھی۔ کسی نے سی ڈی پلیئر آن کر دیا۔ ایک طرف سے آواز آئی، اقبال بانو۔ کئی مہمانوں نے تالیاں بجا کر تائید کی۔ فضا میں اقبال بانو کے ترنم میں گولا باری کی آواز دب کر معدوم ہو گئی تھی۔ مجھے لگا جیسے سخت گرم دوپہر کے بعد اچانک ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلنے لگے ہوں......

(بشکریہ: روزنامہ ''جنگ'' ۲۰۰۱ء)

ایوب خاور

اشرف شاد

ایوب خاور ایک ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت ہیں اور اپنی ہر جہت میں کمال کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن اب تک میرا خیال تھا کہ وہ چونکانے والی صفت کے حامل نہیں ہیں۔ چونکانے کی کوشش کرنے والے عموماً رستے میں کندھا مارتے ہوئے چلتے ہیں جبکہ ایوب خاور دوسروں کے کندھے بچا کر اور اپنا کندھا سنبھال کر رستہ طے کرتے ہیں۔ وہ مجھ جیسے شخص کی طرح اونچی آواز میں لاف وگزاف بھی نہیں کرتے بلکہ ان معاملات پر بھی جن کی وہ مہارت رکھتے ہیں دوسروں کی رائے سن کر صرف سر ہلا دیا کرتے ہیں۔ ایوب خاور ایک دھیمے لہجے کے بہت منکسر المزاج شخص ہیں لیکن اب اس عمر میں انہیں اچانک ہمیں چونکانے کا خیال آیا ہے۔ انہوں نے اپنی نئی تخلیق ''محبت کی کتاب'' دے کر کم از کم مجھے تو چونکا دیا ہے۔

ان سے تین روز پہلے ملاقات ہوئی تھی تو انہوں نے کتاب کی اشاعت کی خبر دی تھی، دو دن پہلے ملے تو کتاب بھی دی اور ایک دن پہلے ملے تو کتاب کی تقریبِ رونمائی کا دعوت نامہ دیا۔ میں نے کتاب کھولے بغیر یہ فرض کر لیا تھا کہ شاعری کی کتاب ہوگی۔ شاعری کی کتاب پر کچھ بولنا اور لکھنا بہت آسان ہوتا ہے۔ صاحبِ کتاب خود مدد کرتا ہے، شعروں پر نشان لگائیے اور روایتی جملوں کے عینک لگا کر پڑھتے جائیے، مقالہ تیار ہے۔ محترم نقاش کاظمی سے بہتر یہ کون جانتا ہوگا۔ وہ پچھلے بیس برس میں پانچ سو سے زیادہ شعری مجموعوں کی تعارفی تقاریب کا اہتمام کر چکے ہیں اور ۲۴ گھنٹوں کے نوٹس پر آدھے درجن ایسے مقررین کا بندوبست کر سکتے ہیں جو کتاب پڑھے بغیر بھی

صاحبِ کتاب کے شعری محاسن بیان کر سکتے ہوں۔

میں نے بھی اسی توقع کے ساتھ آج صبح جب کتاب کھولی تو ہر صفحہ در حیرت کی طرح کھلتا گیا۔ مجھے اب یہ افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے کتاب پہلے کیوں نہیں پڑھی تھی۔ مختصر سے وقت میں اس کتاب کا اس گہرائی سے جائزہ لینا مشکل تھا جس کا یہ کتاب تقاضا کرتی ہے۔ اس کتاب کو بہت غور سے پڑھنے، سمجھنے اور اس میں شامل ہونے کی ضرورت تھی بلکہ ضروری تھا کہ کتاب کچھ دیر اپنے نرغے میں لیے رہے۔ ایوب خاور نے محبت کے حوالے سے کیا خوب صورت چند سطریں لکھی ہیں ؎

تیرا خط پڑھ کے اور تیری سچائی کے
مخملیں حُسن کا لمس محسوس کر کے
یقین آ گیا ہے کہ میں اب محبت کے نرغے میں ہوں

میں بمشکل اس کتاب کے نرغے سے نکل تو آیا لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ ایوب خاور نے 'محبت کی کتاب' کی شکل میں جو نیا تجربہ کیا ہے اس پر کسی وقت زیادہ سنجیدگی اور توجہ سے لکھا جائے اور دنیا کے دوسرے سماجوں کے ادب میں اس طرح کی اصناف یا تجربے موجود ہیں تو ان سے ایوب خاور کے اس تخلیقی تجربے کا تقابل کیا جائے۔

میرا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ 'محبت کی کتاب' کو کس صنف میں شمار کیا جائے۔ یہ ایک کہانی بھی ہے اور ایک افسانہ بھی۔ اس میں ایک ناول کے تمام اجزائے ترکیبی بھی موجود ہیں یعنی اس میں وہ سب کردار موجود ہیں جنہیں نسل در نسل پھیلا کر ناول کی ضخامت حاصل کی جا سکتی ہے، اور شعریت تو اس کی اساس اور بنیاد ہے۔ اس میں جگہ جگہ ایسی شعری لائنیں ہیں جنہیں ایک پُر کیف غزل کا قالب دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً 'یہ کیسا آئینہ خانہ ہے' کی چند لائنیں ؎

یہ کیسا آئینہ خانہ ہے
جس میں میرے چہرے کی جگہ
اب ہر طرف تیرا ہی چہرہ ہے

'جاگتی آنکھوں کا نوزائیدہ خواب' بھی ایک خوب صورت تمثیل ہے اور اسی طرح ماں بیٹی کا مکالمہ بھی۔ ایوب خاور کی مکالماتی شاعری کا یہ تجربہ بڑی حد تک اطالوی یا روسی بیلے سے ملتا جلتا ہے اور اسے موسیقیت کا لبادہ پہنا دیا جائے تو یہ صوتی اعتبار سے ایک بھرپور تاثر چھوڑ سکتا ہے۔

ان سب چیزوں کے ساتھ 'محبت کی کتاب' ایک بھرپور ڈرامہ بھی ہے۔ اس کی کہانی کئی ڈرامائی موڑ لیتی ہے، اس میں conflict بھی ہے اور resolution بھی اور ایک بھرپور انجام بھی۔ تاہم مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے مجھے اس کے انجام سے اختلاف ہے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور مکروہ آواز ایک خوب صورت جذباتی ڈرامے کی تمام تر حیثیت اور جذباتیت اور محبت کی تمام نزاکتوں کو اچانک ختم کر دیتی ہے اور کتاب کے آخری چھ صفحات میں محبت کی ایک بہت نرم سی معصوم کہانی دہشت گردوں اور یرغمالیوں کی نذر ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ محبت کی کتاب میں دل کی دھڑکنیں جس لہجے میں گفتگو کر رہی ہیں اور مدھم سی دل میں اترنے والی جو موسیقی ہے وہ آخری چھ صفحوں کے منظر نامے سے لگا نہیں کھاتی۔ ایوب خاور ڈرامے کے آدمی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ 'محبت کی کتاب' کو ڈرامے کی شکل بھی دیں گے۔ شاید اسی لیے انہوں نے ایک ایسا انجام رکھا ہے جس کی ڈرامائی تشکیل زیادہ پُراثر ہو۔ جذبات کو کیمرے کی آنکھ سے پڑھنا آسان نہیں ہوتا لیکن ایوب خاور کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ وہ جذبات کو ڈرامائی تشکیل دینے کا ہنر جانتے ہیں ان کے بہت سے ڈرامے اس کا ثبوت ہیں۔ 'محبت کی کہانی' کو بھی وہ ایک نیا جذباتی موڑ دے کر ختم کر سکتے تھے۔ تاہم یہ میری ذاتی رائے ہے جو کلی طور پر غلط بھی ہو سکتی ہے۔

ایوب خاور سے میرا دوستی کا رشتہ چار دہائیوں سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ ہم نے شاعری تقریباً ایک ہی زمانے میں شروع کی تھی، اور ادب وصحافت کے خارزار میں ایک ساتھ قدم رکھا تھا۔ وہ کیمروں کی دنیا میں چلے گئے اور میں چھاپہ خانوں کی۔ اس پورے عرصے میں انہوں نے دونوں تخلیقی شعبوں میں کمال کا درجہ حاصل کیا۔ ڈرامے کی دنیا میں بھی اور شاعری کے میدان میں بھی۔ وہ کبھی نیا تجربہ کرنے سے نہیں ڈرے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں بھی کئی نئے تجربے کیے ہیں۔ انہوں نے جس طرح ایک ایک مصرعے کی نظمیں کہی ہیں اور نظموں میں طویل مصرعے کہنے کی جو طرح ڈالی ہے وہ اپنی جگہ ایک کمال ہے۔ محبت کی کتاب بھی ایک نیا تجربہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ دوسرے قلم کار بھی اس تجربے کی پیروی کریں گے۔ میں ایوب خاور کو ان کی نئی کتاب کی اشاعت پر دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔

(محبت کی کتاب کی رونمائی میں پڑھا گیا کراچی پریس کلب ۲۰۱۲ء)

ریاض رفیع کی بولتی تصویریں

اشرف شاد (برونائی)

گزشتہ تین دہائیوں کے دوران پاکستان میں میرے دوستوں میں ہونے والا شاید واحد اضافہ ریاض رفیع ہے۔ میرے ایک عزیز دوست مسعود حیدر کہا کرتے ہیں کہ ایک خاص عمر کے بعد دوست بننا بند ہو جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے میری، دوست بنانے کی عمر، ایک زمانہ ہوا، گزر چکی ہے۔ ترکِ وطن کیے بھی تیئس برس بیت گئے ہیں لیکن پاکستان میں دوستوں کی شکل میں اتنا سرمایہ محفوظ ہے کہ وہاں چند دنوں یا ہفتوں کے دوران اس سرمائے سے کمایا ہوا منافع تک خرچ نہیں ہو پاتا۔ ایک دن مجاہد بریلوی نے جن کی سیمابی طبیعت انھیں ایک جگہ بیٹھنے نہیں دیتی، اصرار کیا کہ شام کا ''سیٹ'' تبدیل کیا جائے۔

ریاض رفیع کے گھر شام کا جو نیا ''سیٹ'' لگا، اس کا ڈزائن کراچی کے ڈرائنگ روموں میں سجنے والی شاموں سے مختلف تھا۔ یہ ایک بہت میٹھی سی شام تھی۔ جس میں سیاسی مباحث کی کڑواہٹ گھلی تھی اور نہ تاریک مستقبل اور ناامیدی کے اندھیرے۔ اُس شام، بہ قولِ ایوب خاور، ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں ریاض رفیع میرے دوست بن گئے۔

ریاض رفیع کے سُر بہت میٹھے اور مدھم ہیں۔ اُن کے دھمال کی تھاپ کبھی بے قابو نہیں ہوتی۔ اُن کے پاس فن کاروں والی درویشی بھی ہے اور دیوانہ پن بھی۔ ریاض رفیع نے اپنی جو دنیا بسائی ہے، اُس میں اُونچی آوازیں صرف اُن تصویروں کی ہیں جن کی خاموشی ہمہ وقت متکلم رہتی ہے۔ ان تصویروں کے رنگ، نقش، خط اور اشکال اُن کے گھر میں چاروں طرف بکھرے ہوئے

ہیں۔ مجھے اُن کا گھر ایک ایسی آرٹ گیلری نظر آتا ہے جہاں نمائش سے پہلے قطار میں لگی تصاویر دیواروں پر سجنے کی منتظر ہوں۔

ریاض رفیع میں فن کاروں والی بہت سی باتیں ہیں اور بہت سی باتیں نہیں بھی۔ فن کاروں میں عموماً انانیت اور تعلّی سُوجے ہوئے انگوٹھے کی طرح نظر آتی ہے۔ یہ شاید اُن کا حق بھی ہے۔ فن کار اپنے فن پارے دوسرے تخلیق کاروں سے کم تر سمجھنے لگے تو بد دِل ہو کر تخلیقی کاوشیں ترک کر سکتا ہے۔ ریاض رفیع میں یہ انا اور تعلّی نہیں ہے، پھر بھی اُن کا تخلیقی عمل پوری توانائی سے جاری ہے۔ ریاض رفیع نے اپنے گھر کی دیواروں پر نمایاں مقام اپنے ہم عصر مصوروں کو دیا ہے، اپنی تصویریں اِدھر اُدھر چھپا کر رکھی ہیں۔ ان کی گفت گو میں اپنا نہیں بل کہ اپنے عہد کے دوسرے فن کاروں کا تذکرہ کثرت و شدّت سے شامل رہتا ہے۔ میں نے ریاض رفیع کے بارے میں خود ریاض رفیع سے بہت کم سنا ہے۔

ریاض رفیع کا تعلق ان کی جواں سالی کے باوجود ناپید ہوتی ہوئی اس پرانی نسل سے ہے جس نے اپنی ترقی پسندانہ سوچ ابھی تک کسی این جی او کو مستعار نہیں دی ہے۔ وہ اب بھی طبقاتی ناہمواری کو معاشرے میں ہونے والی برائیوں اور ناانصافیوں کی وجہ سمجھتے ہیں اور محض خیراتی کاموں کو اس کا حل نہیں جانتے۔ آج کے اس دور میں جب نظریاتی لکیریں مٹ گئی ہیں یا ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو گئی ہیں، ایک غیر مبہم سوچ رکھنے والے ریاض رفیع کی نظریاتی استقامت حیران کر دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نظریاتی حد بندیاں فن کار کے آفاق تنگ کر دیتی ہیں۔ یہ بھی شاید صحیح ہو کہ کسی سمت کا تعین کیے بغیر بھی فن پارے تخلیق ہو سکتے ہیں لیکن ایسی تخلیقات پر اردگرد کی زندہ حقیقتوں سے بے نیازی اور بے تعلقی جیسے سوال اُٹھ سکتے ہیں۔ میں ریاض رفیع کو اس اعتبار سے بھی ممتاز جانتا ہوں کہ انھوں نے اپنی تخلیق کا دائرہ محدود نہیں رکھا اور وہ کئی سمتوں میں سفر کرنے والے ہمہ سمت مصور ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے جب بھی ضروری سمجھا ہے، خود کو سماجی موضوعات کا پابند کیا ہے۔ ماضی میں کیا ہوا ان کا بہت سا کام اس واقعے کا غمّاز ہے۔

فنِ مصوری کو باریک بینی سے سراہنے کے لیے ایک منظّم کوشش اور باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی کی یہ بات صحیح ہے کہ آرٹ گیلریوں میں بے مقصد گھوم کر نقد و نظر کی صلاحیت حاصل کرنا ایسا ہی ہے جیسے اسپتالوں کے چکر لگا کر سرجری کی نزاکتیں سمجھنا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی تخلیق

اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اسے دیکھنا، پڑھایا سنا نہ جائے۔ جب ہم کوئی سچی تخلیق دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھوں کی دُھند چھٹنے لگتی ہے اور کچھ دیر کے لیے سہی، دکھ اور ملال کے سائے ہلکے پڑ جاتے ہیں۔ ریاض رفیع کے تصویریں ایسا ہی تاثر چھوڑتی ہیں۔

میرے لیے ایک اچھی تصویر کا معیار یہی ہے کہ میں اسے دیکھوں تو وہ گفت گو کرنے لگے۔ مجھے ریاض رفیع کی تصویریں بولتی اور سانسیں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی تصویروں کے ملگجے نیلے رنگ بہت غیر محسوس طریقے سے گہرے ہونے لگتے ہیں، اور پھر ان میں کہیں کہیں سرخی نمودار ہو جاتی ہے اور اب تو یہ رنگ شوخیاں بھی کرنے لگے ہیں۔ مجھے ان کی تصویروں کے مثلثوں، مستطیلوں اور دائروں میں نت نئی عمارتیں بنتی نظر آتی ہیں۔

ان کی تجریدیت بھی جانی پہچانی شکلوں میں ڈھلنے لگی ہے، اور خطاطی صاف پڑھی جانے والی عبارت لگتی ہے۔ کسی نے کہا تھا، آرٹ میں عجیب طرح کی پُراسراریت ہوتی ہے جو مبہوت کرنے والی کشش رکھتی ہے۔ ایسا لگتا ہے، جیسے کوئی چھوٹی بچی اپنے شریر بھائیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔ ریاض رفیع کی تصویروں میں یہ بچی بڑی ہو کر بھی آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔

(ریاض رفیع کی تصویری نمائش پر۔ ۲۰۱۳ء)

نجم الحسن رضوی کی دبئ سے رخصتی پر

اشرف شاد

سب سے پہلے مجھے یہاں بلانے اور کچھ کہنے کا موقع دینے کا شکریہ۔ میرا خیال ہے یہاں موجود ہم سب احباب کو رضوی صاحب کو مبارکباد دینا چاہیے کہ وہ دیر سے سہی، گھر جارہے ہیں۔ جلد یا بدیر خلیجی ممالک میں رہنے والوں پر یہ وقت آتا ضرور ہے، اس موضوع پر پردیس میں رہنے والے دوستوں نے کیا کیا اچھے شعر کہے ہیں۔ اور آخری تجزیے میں یہی بات صحیح ہے کہ یہ خیمے کی رہائش ہے اور کسی نہ کسی وقت طنابیں کھینچنی اور خیمہ سمیٹنا پڑتا ہے۔ ہم ایسے صحرا نشین ہیں جنہیں ان نرم زمینوں میں مستقل پاؤں گاڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم بھی اس ریت کی طرح ہیں جو پانی میں گھل نہیں پاتی، نتھر کر الگ ہو جاتی ہے۔ اس لیے واپسی کا عمل اتنا مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن اتنا آسان بھی نہیں ہوتا کیونکہ آپ اپنی زندگی کے سب سے قیمتی سال یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ یادیں ریت کے ذرّوں کی طرح کونے کدروں میں چھپی رہتی ہیں۔ نجم الحسن رضوی صاحب کا معاملہ خلیج سے واپس جانے والے دوسرے بہت سے مسافروں سے مختلف ہے۔ وہ ادب کی دنیا کے ایسے شہری ہیں جو بہت نمایاں طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت کسی جغرافیے میں محدود نہیں ہے اور جہاں جہاں تک بھی اردو ادب کی پہنچ ہے رضوی صاحب وہاں وہاں کے باسی اور مکین ہیں۔ وہ پاکستان واپس تو جارہے ہیں لیکن اپنے افسانوں کے حوالے سے ان کا قیام ہر اس جگہ ہوگا جہاں جہاں انہیں پڑھا جاتا ہے۔ وہ افسانے کی دنیا کا ایک معتبر نام ہیں۔ اردو ادب کی مرکزی رو سے کٹ کر اپنی ادبی حیثیت کو منوانا آسان نہیں ہے۔ لیکن رضوی صاحب نے عمر کا ایک

بڑا حصہ اردو کے اس ثانوی مرکز میں گزار کر بھی خود کو منوایا ہے، اور بقول کسی کے بہت زوروں سے منوایا ہے۔

آج کا دن ان کی شخصیت اور ادبی حیثیت پر ایک بہت جامع تحریر کا متقاضی تھا، لیکن یہاں کے ماحول یا موسم کی سست روی مجھ پر بھی حاوی ہے۔ اس لیے آپ کی اجازت سے میں وہ مضمون پڑھ رہا ہوں جو چار پانچ سال پہلے اس وقت لکھا تھا جب میں یہاں آیا تھا۔ مضمون کا عنوان 'نجم الحسن رضوی کے شہر میں.......'

آخری بار پاکستان گیا تھا تو میرا صحافی اور افسانہ نگار دوست نعیم آروی زندہ تھا میں نے اسے کراچی پریس کلب کے ڈائننگ روم کے بغلی کمرے میں چھپی ہوئی ایک میز پر پایا تھا جہاں وہ بلڈ پریشر، ذیابطس، کولیسٹرول اور کئی انجانی بیماریوں کی دوائیں سجائے بیٹھا چائے میں شوگرین کی گولی ڈال کر ہلا رہا تھا۔

''تم نجم الحسن رضوی کو جانتے ہو؟'' گفتگو کے کسی موڑ پر اس نے پوچھا۔ ''وہ اپنا ٹی وی والا؟ وہ نیویارک میں ہے پچھلے سال گیا تھا تو ملا تھا۔''

''وہ نہیں! افسانہ نگار نجم الحسن رضوی!'' نعیم آروی نے مجھے گھورتے ہوئے اس طرح کہا جیسے نجم الحسن رضوی کو نہ جاننا جرم تھا۔ مجھے بھی یاد آ گیا۔ بہت برس پہلے جوانی کی دہلیز پر کبھی آمنا سامنا ہوا تھا۔ میں مشرق میں تھا اور نجم الحسن رضوی انفارمیشن میں۔ اس زمانے میں افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی ان کا نام سنا تھا۔ میں نے پھر بھی تغافل سے کام لیا۔

''میں تو صرف ایک افسانہ نگار کو جانتا ہوں اور وہ ہے نعیم آروی۔''

نعیم آروی اپنی تعریف سے پہلی بار خوش نہیں ہوا۔ وہ خود افسانے کی دنیا کا ایک معتبر نام تھا۔ اس کے افسانوں کے نصف درجن مجموعے شائع نہ ہوتے تب بھی اس کا ایک افسانہ ''بندی گھر'' اسے زندہ رکھتا۔ سرکاری دفتر میں ایک نوجوان کلرک کے پہلے دن کی کہانی جب اس نے تاریک کمرے کی کھڑکی کھولی تو روشنی کی کرن دیکھتے ہی سب آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چیخ پڑے تھے۔

''کھڑکی بند کرو خبیث، کیا ہماری آنکھیں پھوڑو گے''۔

''ادب لکھنے اور پڑھنے والا کوئی بھی شخص نجم الحسن رضوی کو جانے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' نعیم آروی نے میری جہالت پر حکم لگایا اور مجھے پہلی بار شاعر اور افسانہ نگار کے درمیان ایک اور فرق

معلوم ہوا۔ ایک شاعر کے سامنے دوسرے شاعر کی تعریف کرنا بدتمیزی ہے، لیکن ایک افسانہ نگار اپنے ہم عصر افسانہ نگار کو فن کی پہچان قرار دے رہا تھا۔

نعیم آروی سے یہ ملاقات اس وقت یاد آ جاتی جب میں سڈنی چھوڑ کر امارات آ رہا تھا تو ان دوستوں کو جواب دینا آسان ہو جاتا جو میرے جانے کی خبر سن کر حیرت کر رہے تھے کہ اتنی دور، آخر کیوں؟ حیرت اس لیے نہیں تھی کہ دبئی آسٹریلیا سے ہزاروں میل دور ہے۔ آسٹریلیا سے ہر ملک ہزاروں میل دور ہے۔ فاصلے دوریاں ناپنے کا پیمانہ نہیں ہوتے۔ میں 30-28 گھنٹے کا سفر کر کے لندن گیا تھا تو کسی نے نہیں کہا تھا "اتنی دور! آخر کیوں؟" لیکن نقلِ مکانی کراچی سے صرف دبئی تک کی بھی ہو تو رخصت ہونے کا مزہ آ جاتا ہے۔ الوداعی دعوتیں، ایئر پورٹ چھوڑنے آنے والوں کا ہجوم، امام ضامن، آنکھوں میں نمی۔ یہ دو گھنٹے کا نہیں برسوں کا سفر ہوتا ہے۔ اس بار سڈنی سے دبئی آتے ہوئے پورا خیمہ لپیٹ کر کمر پر لادا تو رخصتی کے سب لوازمے پورے ہو گئے، لیکن وداع کہنے والے دوستوں نے بار بار پوچھا اتنی دور! آخر کیوں؟ میں "یہ کروں گا وہ کروں گا" کے چوکے چھکے لگاتا رہا، سب نے مروّتاً سر ہلائے لیکن آنکھوں میں بے یقینی بھری تھی جیسے لکھا ہو "ہمیں پتا ہے، جیسے جا رہے ہو ایسے ہی واپس بھی آ جاؤ گے"۔

مجھے اس وقت سلیم جعفری کی بہت یاد آئی۔ وہ ہوتا تو نقل مکانی کے لیے کہانیاں نہ تراشنا پڑتیں۔ کوئی پوچھتا اتنی دور! آخر کیوں؟ میں کہتا وہاں سلیم جعفری رہتا ہے۔ کسی کی آنکھوں میں بے یقینی نہیں ہوتی سب کو یقین آ جاتا جو کہہ رہا ہوں وہ کر کے آؤں گا۔

میں سلیم جعفری کو اس کے بہت سے دوستوں کی طرح صرف دبئی کے مشاعروں اور اس کی نظامت کے حوالے سے نہیں جانتا تھا۔ مجھے 60ء کی دہائی کا چھریرے بدن والا وہ جامہ زیب سلیم جعفری یاد ہے جو ہر شام گرے رنگ کی پتلون اور کریم سلک ملز کی تازہ تازہ آئی ہوئی کیرولین کی قمیص پہنے اور ہاتھ میں بغیر فلٹر والے کیپسٹن سگریٹ کا پیکٹ لیے "کیفے ایمپریز" آتا تھا جہاں سب اپنے اپنے خواب لیے بیٹھے ہوتے۔ (کہاں گئے وہ خواب؟) کبھی کبھی خواب ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے لیکن اس تصادم سے فضا مکدّر نہیں ہوتی، بس گھنٹیاں سی بجنے لگتیں۔ پاکستان میں اس سے آخری بار 1980ء میں اسی کیفے میں ملا تھا۔ وہ واپس آیا تھا اور میں پہلی (یا شاید دوسری) ہجرت کر کے نیویارک جا رہا تھا۔ اس نے پوچھا تھا اتنی دور! آخر کیوں؟ میں نے کہا تھا میں

جو ہر میر کے شہر جا رہا ہوں، سب دوست مطمئن ہو گئے تھے۔ میں اپنی ربع صدی کی دربدری میں اشفاق حسین کے شعر کی طرح گملا بنا ہوا جس شہر کے دریچے پر سجا رہا اسے مجھے کسی نہ کسی دوست کے نام کرنا اچھا لگتا ہے۔ نیو یارک میں ''ہجرۂ میر'' کا بہت چرچا تھا جہاں مرحوم ضمیر جعفری اور شوکت صدیقی سے لے کر منوں بھائی تک مکین رہے تھے۔ اس وقت نیو یارک جو ہر میر کا شہر تھا اسی طرح بحرین سعید قیس کا شہر تھا جنہوں نے لاہور میں ساغر صدیقی اور منیر نیازی کے ساتھ ''شاعر گردی'' کرتے ہوئے شاید سوچا بھی نہ تھا کہ قیس کو ایک دن سچ مچ صحرا نوردی کرنا پڑے گی۔

بحرین سے کویت گیا تو وہاں ایک ہجوم تھا۔ کون کون آیا اور گیا۔ سڈنی پہنچا تو وہ ڈاکٹر شبیر حیدر اور کنیز فاطمہ علی کا شہر تھا۔ کہاں جا کر انہوں نے اردو کی کیاریاں بنائی تھیں اور شاعری کے بیج بوئے تھے۔ اب تو ماشاءاللہ وہاں بھی شاعروں کی فصل چاروں طرف لہلہا رہی ہے۔ امارات پہنچا تو میں تقریباً ڈیڑھ مہینے تک ہر شب العین میں اپنے گھر کی اوپری منزل سے سورج کے طلوع و غروب کے منظر اور رات میں جبلِ حفیط پر آسمان کو جاتی ہوئی روشنیوں کی گزرگاہ دیکھتا رہا جسے ایک دوست جنت کا راستہ کہتے ہیں۔ دبئی کے دروازے پر دستک دی، نہ اس کی اسکائی لائن دیکھی اور نہ ٹریفک میں پھنسی ہوئی گاڑیوں کا ہجوم۔ اسی زمانے میں نجم الحسن رضوی کا فون آ گیا۔ فون آیا تو یادوں کے کتنے ہی دریچے وا ہو گئے۔ یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ دبئی کو کس کا شہر کہا جائے۔ دبئی جانے کا راستہ بھی کھل گیا۔ نجم الحسن رضوی بہت وفادار انسان ہیں۔ جس طرح خلیج ٹائمز سے جڑے تو جڑے رہے، دبئی آئے تو وہیں کے ہو رہے اس طرح افسانے کا دامن بھی نہیں چھوڑا۔ اپنے ملک سے باہر آتے ہی کیسے کیسوں کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ شاعر بن کر شہرت کے آسمان پر جا پہنچتے ہیں۔ شاعری آسان کام بھی ہے خاص کر ان کے لیے جنہیں شاعری نہیں آتی۔ پردیس میں اپنی شاعری کے لیے مشہور ایک خاتون نے اپنی غزل سنائی تو ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ''قافیہ کہاں ہے؟'' کہنے لگیں ''قافیہ کیا؟''

نجم الحسن رضوی اسی اعظم گڑھ کے ہیں جہاں شاعری گھر کی باندی ہوتی ہے۔ جب چاہتے پہنچا پکڑ کر اپنی ڈیوڑھی پر بٹھا لیتے، لیکن وہ شاید شارٹ کٹ کے عادی نہیں ہیں اور اب تک افسانے جیسے مشکل کام سے بندھے ہوئے ہیں۔ ناروے میں مقیم مشہور ہندوستانی افسانہ نگار ہر

چرن چاؤلہ ایک بار شکایت کرنے لگے ''کوئی افسانہ سننے نہیں بلاتا اس لیے میں نے بھی شاعری شروع کردی ہے۔'' اس کے بعد انہوں نے کئی ماہیے سنائے۔ ان کی عمر نے وفا نہیں کی ورنہ وہ افسانہ نگار کی جگہ شاعر کہلاتے۔

میں ایک صبح رضوی صاحب کی کتاب کھولے ''پنجرہ'' دوبارہ پڑھ رہا تھا۔

''چڑیا خانہ خود ہمارے اندر ہے۔ خواہشوں کا چڑیا خانہ، اور ہر چڑیا دراصل ہماری ناآسودہ تمنا ہے جو ہماری روح کی منڈیر پر بیٹھی انجانے گیت گاتی رہتی ہے۔''

اسی وقت میری بیوی نے آکر کھڑکی کا پردہ کھول دیا اور میں نعیم آروی کے ''بندی گھر'' کا کردار بن گیا۔ ''پردہ بند کرو! کیا میری آنکھیں پھوڑو گی۔'' مجھے لگا میری آواز نجم الحسن رضوی کے پنجرے میں بند طوطے کے گلے سے نکلی ہے۔

(دبئی، ۲۰۰۹ء)

ہمہ جہت، ہمہ صفت شمیم زیدی

اشرف شاد

شمیم زیدی کے کارٹونوں کی کتاب نے پاکستان کی پچھلے چالیس برسوں کی تاریخ کے موڑ یاد دلائے ہیں، ساتھ ہی اس کتاب میں ان کی زندگی کے اوراق بھی پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ ان کے کارٹونوں کو پاکستان کے مختلف سیاسی ادوار میں آسانی سے منقسم کیا جا سکتا ہے، یعنی بھٹو صاحب سے پہلے اور بھٹو صاحب کے آنے کے بعد کا دور، اس کے بعد ردِ انقلاب کا یعنی ضیاء الحق کا دور اور پھر ضیاء الحق کے نہ ختم ہونے والے دور کے بعد دخترِ مشرق بے نظیر بھٹو کا دور۔ اس کے بعد کے ادوار کا تذکرہ فضول ہے کیونکہ وہ میوزیکل چیئر کھیلنے کا زمانہ تھا۔

شمیم کی اپنی زندگی نے جو کروٹیں لی ہیں وہ ہوسکتا ہے پاکستان کے سیاسی مدّوجزر کا براہِ راست نتیجہ نہ ہوں، لیکن اس کے متوازی ضرور رہی ہیں اور میں اسی حوالے سے شمیم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر لکھنا چاہتا تھا لیکن اس طرح بہت سی باتیں کتاب کے موضوع سے متعلّق نہیں رہیں گی۔

کارٹونوں کے فنّی محاسن کا کھوج لگانے کے لیے جس باریک بینی کی ضرورت ہے وہ شاید مجھ میں نہ ہو لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ ایک اچھے کارٹونسٹ کے لیے لازم ہے کہ خاکہ کشی کے لیے اس کے قلم یا برش سے بننے والی لکیریں پختہ ہوں، اس کے مزاح میں برجستگی ہو اور وہ حالاتِ حاضرہ کا پورا علم رکھتا ہو۔ ان تینوں خصوصیات کے امتزاج سے چند لکیروں اور ایک جملے پر مشتمل کارٹون طنز و مزاح کی جو چوٹ مارتا ہے وہ سینکڑوں الفاظ پر مشتمل مضمون کے ذریعے بھی ممکن نہیں

ہوتی۔لیکن یہ آسان کام نہیں ہے۔

مجھے ستر کی دہائی کا ایک واقعہ یاد ہے جب 'جنگ' نے اپنے کارٹونسٹ کو جن کا نام غالباً فیروز تھا برطرف کر دیا تھا۔ پاکستان میں ضیاء الحق کا دور تو تھا ہی، بھٹو صاحب کا زمانہ بھی آزادیٔ صحافت کے لیے زیادہ سازگار نہیں تھا۔ کارٹونوں میں بھی کاٹ نہیں رہی تھی، اس لیے وہ بے اثر ہو گئے تھے۔ ارشاد زیدی نے اخباری کارٹونوں کا معیار بہت بلند کر دیا تھا جس تک پہنچنا ہر ہم عصر کارٹونسٹ کے لیے آسان نہیں رہا تھا۔ میں اس زمانے میں کراچی یونین آف جرنلسٹس کا عہدیدار تھا اور ایک برطرف ساتھی کو بحال کرانا ہمارے فرائض میں شامل تھا۔ ہم نے منہاج برنا کی قیادت میں ایک وفد ترتیب دیا اور 'جنگ' کے بانی مالک میر خلیل الرحمٰن سے ملے۔ مجھے میر صاحب کی وہ بات آج تک یاد ہے جو انہوں نے اپنے کارٹونسٹ کی برطرفی کا جواز دیتے ہوئے کہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ پابندیوں کے دور میں ایک اچھا کارٹونسٹ اپنی تخلیقی صلاحیتیں استعمال کر کے ایسا درمیانی راستہ نکالتا ہے کہ پکڑ میں بھی نہ آئے اور بات بھی کہہ جائے۔ میر صاحب نے ہماری درخواست پر اپنے کارٹونسٹ کو بحال تو کر دیا تھا لیکن وہ ملازمت پر بحال ہونے کے کچھ عرصے بعد ہی یہ کام چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔

میرا خیال ہے میر صاحب نے اپنے اچھے کارٹونسٹ کی جو تعریف بیان کی تھی وہ زیادہ غلط نہیں تھی۔ صحافت تخلیقی عمل نہیں ہے، خواہ وہ خبر سازی ہو یا کالم نگاری۔ لیکن اخباری کارٹون صحافت کا حصہ ہونے کے باوجود تخلیقی عمل اور فنکاری کے زمرے میں آتا ہے۔ پہلے تو یہ کہ کارٹونسٹ کو تصویر بنانے کا فن آتا ہو، پھر اسے یہ کمال بھی حاصل ہو کہ کم سے کم لکیروں کے ذریعے چہرہ سازی کر سکے اور جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ کہے بغیر اپنے پیغام کی تشکیل کر سکے۔ وہ تبصرہ کر رہا ہے، طنز بھی اور ساتھ ہی مزاح بھی پیدا کر رہا ہے، چوٹ لگا رہا ہے اور اسے سہلا بھی رہا ہے۔ اور ان سب کاموں کے لیے اس کے پاس صرف پاکٹ سائز کی ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔

شمیم زیدی، میری نظر میں ایک اچھے کارٹونسٹ کی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ ان کی تخلیقی جبلّت نے ان کی حسِ مزاح اور حالاتِ حاضرہ کے علم سے ہم آغوش ہو کر کارٹونوں کے جو فن پارے تخلیق کیے ہیں وہ اپنے اپنے زمانے کے سیاسی شعور کی اچھی تصویر کشی کرتے ہیں۔ میں یہ بات اس لیے بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کے اس تخلیقی عمل کو دو سال تک بہت

قریب سے دیکھا ہے۔

میں ۱۹۸۷ء میں روزنامہ 'عرب ٹائمز' کے اردو سیکشن کا ایڈیٹر ہو کر کویت گیا تھا جہاں شمیم پہلے سے موجود تھے اور کمپیوٹر پروگرامر کی حیثیت سے کسی بڑے ادارے سے وابستہ تھے۔ میں ان کی صلاحیتوں سے واقف تھا اس لیے وہ میرے اصرار پر عرب ٹائمز سے جز وقتی طور پر وابستہ ہو گئے تھے۔ لیکن ان کا کام میرے کئی کل وقتی صحافیوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ وہ فیچرز لکھتے، ترجمے کرتے، نئی فلموں پر تبصرے کرتے اور کارٹون بناتے۔ وہ کویت کے ایک اور انگریزی روزنامے 'کویت ٹائمز' میں بھی کارٹون بناتے رہے تھے لیکن پھر کسی وجہ سے انہوں نے یہ سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ اس کتاب میں شامل بیشتر کارٹون کویت کے زمانے کے ہیں۔

شمیم نے کارٹونسٹ کی حیثیت سے کامیابی کا ایک تمغہ ابتدائی دور میں ہی حاصل کر لیا تھا۔ کراچی کے 'ڈیلی نیوز' میں انہوں نے سیاسی کارٹون بنانے شروع کیے ہی تھے کہ ان کا ایک کارٹون مولویوں کے عتاب کا نشانہ بن گیا اور اخبار کی کاپیاں جلائی گئیں۔ اس طرح کا شدید ردِعمل ان کے کارٹون کی اثر انگیزی کا ثبوت تھا۔

شمیم کی زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے ڈر یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ یہ میری بھی آپ بیتی نہ بن جائے۔ یہ سفر کرتے ہوئے ماضی میں کئی چھلانگیں لگانی پڑیں گی۔ پچھلی چھلانگ آسٹریلیا کی تھی جہاں وہ اور ہم ۱۹۸۹ء میں ایک ساتھ وارد ہوئے تھے بلکہ میرا کچھ اسبابِ سفر ان کے ہی ساتھ آسٹریلیا آیا تھا۔ آسٹریلیا میں جلد ہی وہ فن وادب کی دنیا کا محور بن گئے۔ یہاں بھی انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو کرتے آرہے تھے، بلکہ وہ بھی کیا جو اس سے پہلے نہیں کیا تھا یعنی کاروبار......! اس سے پچھلے دور کی طرف چھلانگ لگائی جائے تو وہ کویت کا زمانہ تھا جہاں ان کے ساتھ میرے بھی کچھ مہ و سال گزرے تھے۔ کویت میں وہ کمپیوٹر کے شعبے سے وابستہ رہنے کے ساتھ ساتھ صحافت بھی کرتے رہے، اسٹیج ڈرامے اور صداکاری بھی، کارٹون بھی بناتے رہے۔ وہاں انہوں نے کئی ویڈیو فلمیں بھی بنائیں جن میں ان کی ایک فلم جو دلیپ کمار اور امیتابھ بچن کے تقابل پر مشتمل تھی بہت مشہور ہوئی۔

کویت سے پہلے کا زمانہ کراچی کا تھا جہاں میں نے شمیم زیدی کو ایک لیبر یونین کے لیڈر کے روپ میں دیکھا۔ وہ امریکن لائف انشورنس کمپنی کی یونین میں سرگرم تھے اور ادارے کے

برطرف ملازمین کی بحالی کی مہم چلا رہے تھے۔ وہ کہیں سے بھی لیبر لیڈر نظر نہیں آتے تھے، نہ ان کے بال میلے الجھے اور بکھرے ہوئے، نہ آنکھوں میں شعلگی تھی، نہ شیو بڑھا ہوا اور نہ کے ٹو کی دھن میں مگن۔ وہ ہمیشہ دھلے دھلائے نکھرے نکھرے اور بہت جامہ زیب نظر آئے۔ میں نے کبھی ان کی قمیص کا کالر میلا یا پتلون کی کریز ٹوٹی ہوئی نہیں دیکھی، البتہ ان کے ہاتھوں میں ولز سگریٹ کی ڈبیا ہمیشہ دیکھی۔ ان کی طبیعت میں جو نفاست ہے وہ ان کے ظاہر میں ہمیشہ نمایاں رہی۔ یونین لیڈر کی حیثیت سے بھی انہوں نے بہت کامیاب زمانہ گزارا اور برطرف ملازمین کو بحال کرا کے دم لیا تھا۔

شمیم ایک ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخص ہیں اور ادب و فن اور صحافت کے ہر شعبے میں اپنا وجود منواتے رہے ہیں، بس ایک کام ان سے رہ گیا، انہوں نے کبھی شاعری کے کوچے کا رُخ نہیں کیا اور یہ شعبہ ہم جیسے کم سخن لوگوں کے لیے چھوڑ دیا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی کارٹونوں کی یہ کتاب بہت دلچسپی سے دیکھی جائے گی۔

اشکال سے اشعار تک

(الطاف رانا کے شعری مجموعے کے تعارف میں)

اشرف شاد

الطاف رانا نے بحرین سے اپنے اشعار بھیج کر کس پرانے زمانے کی یاد دلا دی ہے! زمانے کی نہیں زمانوں کی، کیونکہ بحرین سے پہلے کا زمانہ زیادہ جنوں خیز تھا۔ یہ دنیا بدلنے کے خواب دیکھنے کا زمانہ تھا، جب آنکھوں میں چنگاریاں اور زبان میں شعلے بھرے ہوتے تھے، لیکن جب وطن چھٹتا ہے یا مجبوراً چھوڑنا پڑتا ہے تو سب چنگاریاں بجھ جاتی ہیں اور شعلے خاک بن جاتے ہیں۔

ہم جیسے لوگ جو وطن میں کچھ تیر مار کر آئے ہوں انہیں دیارِ غیر میں پہچان کے بحران سے گزرنا پڑتا ہے۔ بحرین میں الطاف رانا بھی اسی بحران سے گزر رہے تھے۔ میں نیویارک میں خودساختہ جلاوطنی کے تین برس گزار کر ۱۹۸۳ء میں بحرین آیا تھا جہاں یاسمین یونیورسٹی میں پڑھا رہی تھیں۔ الطاف رانا فوٹوگرافی کے اپنے پرانے پیشے سے متعلق تھے اور پولیس سروس میں تھے۔ وہ ایک زمانے تک اسی ملازمت میں رہے اور یہیں سے ریٹائر بھی ہوئے، پولیس کے ہی قلعے میں ان کی رہائش بھی رہی۔ لیکن بحرین میں کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں اسی پولیس برادری سے ایک زمانے تک آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے۔

اس زمانے میں اخباری فوٹوگرافروں کا کیمرہ پولیس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے بیل کے لیے سرخ کپڑا اور الطاف رانا کے کندھے پر یہ سرخ کپڑا ہمہ وقت ٹنگا رہتا تھا۔ مجھے پاکستان کے وہی الطاف رانا یاد تھے جو اپنی ویسپا پر سوار اپنے کیمرے کے ساتھ کسی نہ کسی موقع کی جگہ موجود ہوتے۔ وہ بہت تیزی سے حرکت کرتے اور جہاں سے گزرتے ہوا میں ایک نامحسوس سی توانائی چھوڑ جاتے۔

بحرین کے چھوٹے سے جزیرے میں جہاں پاکستانیوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی ایک ایسے دوست کا مل جانا جسے میں اور جو مجھے جانتا ہو ایک نعمت سے کم نہیں تھا۔ پاکستان میں دوستوں اور دشمنوں کی جو صف بندی تھی وہاں ہم دونوں ایک ہی صف میں کھڑے رہے تھے۔ دونوں ایک ساتھ ہی اس وقت کے فوجی حکمرانوں کا نشانہ بنے تھے۔ الطاف رانا 'جنگ' سے نکالے گئے اور میں 'مشرق' سے، اور پھر اس کے بعد کا زمانہ تاریخ کا حصہ ہے۔ الطاف رانا بھٹو صاحب کی جدوجہد کے دوران ان کے کافی قریب رہے اور بھٹو صاحب کے تاریخی جلسوں کی تصویر کشی کے لیے ان پر بہت بھروسہ کیا جاتا تھا۔ ان کے اس زمانے کے کئی کارنامے بھی ہیں جن کا تذکرہ کرنے کا یہ موقع نہیں ہے پھر بھی میں ایک واقعہ کا ذکر ضرور کروں گا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بھٹو صاحب کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ وہ ٹرین کے ذریعے پاکستان کا سفر کرتے ہوئے کراچی آ رہے تھے۔ ہر اسٹیشن پر ان کے استقبال کے لیے ہزاروں کا مجمع ہوتا۔ الطاف رانا اس پورے سفر کی عکاسی کر رہے تھے۔ اسی ٹرین میں صفِ اوّل کے ایک سیاست دان ممتاز دولتانہ بھی سفر کر رہے تھے جو اُس وقت کی مسلم لیگ کے سربراہ تھے۔ کراچی سے پہلے ٹرین ایک سنسان مقام پر رکی تو وہ خاموشی سے اتر گئے۔ وہ الطاف رانا کی نگاہ سے بچ نہیں سکے اور الطاف رانا بھی ان کے پیچھے ٹرین سے کود گئے۔ راستے بھر دونوں کے درمیان مکالمہ جاری رہا اور ساتھ ہی الطاف رانا کے کیمرے کا شٹر بھی چلتا رہا۔ دوسرے دن اخبار میں جب ممتاز دولتانہ کے فرار کا فیچر چھپا اور بھٹو صاحب نے یہ کہہ کر اپنی بذلہ سنجی کا مظاہرہ کیا تھا کہ 'چوہا بھاگ گیا' اس روز ممتاز دولتانہ کا سیاسی کیریئر ختم ہو گیا تھا۔ لیکن پھر یہ بھی تاریخ کا ہی حصہ ہے کہ بھٹو صاحب نے جسے 'چوہا' کہا تھا اسی کو برسرِ اقتدار آنے کے بعد برطانیہ کا سفیر مقرر کیا۔

الطاف رانا پیپلز پارٹی کے ترجمان اخبار 'مساوات' سے وابستہ ہو گئے تھے اور ہم کچھ سر پھرے نوجوان صحافیوں نے ارشاد راؤ کی قیادت میں 'الفتح' نکالا تھا۔ الطاف رانا ہمیں خاموشی سے تصاویر فراہم کیا کرتے تھے جس کا انہوں نے کبھی معاوضہ نہیں مانگا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ضرورت پڑنے پر الطاف رانا نے حکمران پارٹی کے وزیروں سے بھی رعایت نہیں کی۔ میں نے 'الفتح' کے لیے ایک سینئر وزیر کی بدعنوانیوں اور رنگ رلیوں کی کہانی لکھی تھی لیکن موقع کی تصویروں کے بغیر بات نہیں بن رہی تھی۔ الطاف رانا کی تلاش ہوئی۔ 'الفتح' میں جب 'موقع کی تصویروں' کے ساتھ کہانی چھپی تو پیپلز پارٹی کے اس سینئر وزیر کا مستقبل

بھی داؤ پر لگ گیا۔ یہ راز کسی کو کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ تصویریں کس نے دی تھیں۔

یہ دور بھی گزر گیا اور ملک پر ضیاء الحق کے طویل دور کی تاریکی چھا گئی۔ ہم سب اپنے اپنے عذاب بھگت رہے تھے، کسی کو پتا بھی نہیں چلا کہ الطاف رانا پاکستانی صحافت کے افق سے کہاں غائب ہو گئے۔ ایک سُنی اَن سُنی یہ تھی کہ بیگم نصرت بھٹو نے انہیں کچھ اہم کاغذات دے کر ملک سے باہر بھیج دیا ہے۔ اتنے برسوں بعد جب میں نے انہیں بحرین میں پایا تو انہوں نے اس سلسلے میں کبھی کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی بحرین میں کسی کو اپنے صحافیانہ کارنامے یاد دلائے۔ بحرین میں انہوں نے مشکل زمانے بھی گزارے اور پاکستان میں پیپلز پارٹی کے اچھے زمانے بھی آئے لیکن الطاف رانا پیپلز پارٹی کی حکم رانی کے کسی بھی دور میں اپنا قرض وصول کرنے پاکستان نہیں آئے۔

الطاف رانا کی شاعری کی کتاب کی اشاعت کے موقع پر شاید ان سب باتوں کا وقت نہیں تھا، لیکن یہ سب باتیں کہی جانی بھی ضروری تھیں اور مجھے نہیں معلوم کہ یہ باتیں کہنے کا دوسرا موقع کب آئے گا۔ شاید ان کی تصویروں کی کتاب کی اشاعت کے موقع پر جس کا منصوبہ وہ ایک عرصے سے بنائے بیٹھے ہیں۔

پاکستان میں ہم نے ایک دوسرے کو شاعر کے روپ میں نہیں دیکھا تھا اس لیے بحرین میں انہیں شاعر کی حیثیت میں پایا تو خوشی ہوئی۔ وہ بہت خوبصورت لحن سے اور ڈوب کر غزل پڑھتے تھے اور بحرین کی ہر ادبی اور سماجی محفل کی جان ہوتے تھے۔ بقول خود ان کے۔

خود ہی دیکھو کہ کیا اُداسی ہے
آج رانا نہیں جو محفل میں

الطاف رانا نے اشکال سے اشعار تک کا جو سفر طے کیا ہے اور اس نتیجے میں جس کتاب سے نوازا ہے اس پر میں انہیں اپنی اور یاسمین کی طرف سے مبارک باد دیتا ہوں۔ آخر میں ان کے دو اشعار نقل کر رہا ہوں جو ان کی شاعری کے اس مجموعے کا نمائندہ اشعار کہے جا سکتے ہیں۔

اٹھے کتنے ہی طوفاں، اس نے دھارے کو نہیں چھوڑا
مری کشتی کو شاید ہوگئی ہے ضد کناروں سے
ہماری قوتِ گفتار تو صیّاد کیا جانے
زباں کٹ جائے پھر بھی داستاں کہہ دیں اشاروں سے

(۲۰۱۰ء)

ہم کیا ہماری ہجرت کیا

اشرف شاؔد

ہم سب ہجرت زدہ لوگ ہیں جو دوہری وطنیت کے عذاب اور ثواب سہہ رہے ہیں۔ مجھ میں یہ عمل کچھ زیادہ ہی شدید ہے۔ پاؤں میں سفر کے گھنگرو بندھے ہیں اور رقصِ ہجرت جاری ہے۔ افتخار عارف نے کیا اچھا کہا تھا کہ ؎

سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا

جب نقل مکانی کا آغاز ہوا تھا تو میں نے بھی اسی حوالے سے غزل کا یہ مقطع کہا تھا ؎

اِک شاؔد ہی نہیں جو وطن چھوڑ کر بِکا
کتنے گھروں کا مال دکانوں تک آ گیا

یہ ہجرت کا ایک فوری اور کسی حد تک منفی ردِ عمل ہے جو وطن چھوڑنے کے جذباتی صدمے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، لیکن ہم جب اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں، ہمارے قدم جم جاتے ہیں تو ہم پر ہجرت کے مثبت پہلو اجاگر ہونے لگتے ہیں۔ میں ہجرت کو اور نیا وطن شعار کرنے کو ایک مثبت عمل سمجھتا ہوں۔ مذہبی، سماجی، معاشی اور کسی حد تک سیاسی اعتبار سے بھی یہ ایک مثبت عمل ہے۔ مشکل کام جائے رہائش اور جائے روزگار کو وطن بنانے کا عمل ہے۔ یہ ایک بتدریج عمل ہے جس میں انسانی رشتے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ میں اس عمل سے گزر چکا ہوں اس لیے پاکستان سے اپنی تمام تر محبتیں برقرار رکھتے ہوئے پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں میری رہائش اب کہیں بھی ہو آسٹریلیا میرا وطن ہے، اور اس کی وجہ صرف اس ملک کی آب و ہوا، اس کے مرغزار،

جنگل اور صحرا، دریا اور سمندر نہیں بلکہ خاندانی رشتوں اور دوستی کے وہ بندھن بھی ہیں جو ہمیشہ اس نئے وطن سے قربت اور محبت کا احساس دلاتے ہیں۔

نئے وطن کے آفاق عقل و دانش کے آفاق بھی وسیع کرتے ہیں، فکر و نظر کے نئے زاویے بہم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان سے باہر رہنے والے پاکستانی اردو اور انگریزی زبانوں میں جو ادب تخلیق کر رہے ہیں وہ پاکستان کے اندر لکھے جانے والے ادب کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہے۔ اردو ادب کی ترویج کا یہ سفر آسٹریلیا میں اردو سوسائٹی کے زیرِ سایہ شروع ہوا تھا۔ اردو سوسائٹی محض ایک نام یا ایک تنظیم نہیں تھی بلکہ اس سے وابستہ لوگ ایک خاندان کی طرح تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس خاندان کی بنیاد ڈالنے والے بیشتر لوگ اس تقریب میں ایک ساتھ جمع ہیں۔ ہم اکثر مختلف خانوں میں بٹ جایا کرتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب خیز یا منفی بات نہیں ہے۔ یہ تغیر، نمو کا فطری عمل ہے۔ یہ انسانی جبلّت ہے یا Law of Evolution۔ قانونِ ارتقا۔ لکیریں بنتی اور مِٹتی رہتی ہیں۔ جو لکیریں بناتے ہیں وہ انہیں مٹانے اور انہیں پھلانگنے پر بھی قادر ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جو شاعر و ادیب یہاں موجود ہیں وہ میری ان گزارشات میں معنی تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

'پہلی لکیر' افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے افسانے لکھنے چاہئیں تھے یا نہیں۔ میرا اپنا خیال یہی تھا کہ ناول کے کھونٹے سے بندھا رہوں۔ لیکن میں نے چند سال پہلے اپنا چوتھا ناول 'جج صاحب' لکھنا شروع کیا تھا وہ التوا کا شکار ہوتا چلا گیا جس کی وجہ سے مجھے کہانیاں لکھنے کا موقع مل گیا۔ اب وہ دوست جنہیں میں ادب کے حوالے سے بہت محترم جانتا ہوں یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ مجھے افسانے بھی لکھتے رہنا چاہیے۔

ناول نگاری بہت یکسوئی چاہتی ہے، ضروری ہوتا ہے کہ قدم ایک جگہ گڑے ہوں۔ آسٹریلیا میں رہ رہا تھا تو یہ اطمینان حاصل تھا، اس لیے کم عرصے میں پانچ چھ کتابیں نکل آئیں۔ العین میں پچھلے آٹھ برس کا قیام آرام دہ تو بہت تھا لیکن یکسوئی نہیں تھی، اپنا خیمہ اکھاڑ کر اب برونائی لے گیا ہوں، اگر وہاں جم کر بیٹھا رہا تو امید ہے 'جج صاحب' یا کوئی نیا ناول لکھا جا سکے گا۔

(سڈنی میں 'پہلی لکیر' کی تعارفی تقریب میں اشرف شاد کے پڑھے جانے والے مضمون کا اقتباس ۲۰۱۲ء)

تعارفی تقریب صدرِ محترم

اشرف شاؔد

صدرِ محترم جناب ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، مہمانِ خصوصی جناب امجد اسلام امجد، مہمانِ محترم جناب مشتاق احمد یوسفی، جناب حمایت علی شاعر، سینیٹر رخسانہ زبیری، معزز خواتین وحضرات!

میں آپ سب احباب کا دلی طور پر شکرگزار ہوں کہ آپ نے آج کی اس تقریب میں شرکت کر کے میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ مصروفیات، ٹریفک کے مسائل، کراچی کا موسم، ان سب رکاوٹوں کو عبور کر کے آپ کا میری کتابوں پر ہونے والی گفتگو میں شرکت کے لیے آنا آپ کی محبتوں کا وہ عطیہ ہے جس کے لیے میں رسماً نہیں، تہہِ دل سے آپ سب کا شکرگزار ہوں۔

کراچی میں کتابوں کی تعارفی تقریبات ایک رسم، ایک کلچر اور کسی حد تک احباب کی Reunion بن گئی ہیں۔ میں اپنی ہر کتاب کی اشاعت کے موقع پر سوچتا ہوں کیا دوستوں کو امتحان میں ڈالنا ضروری ہے؟ 'بے وطن' اور 'وزیرِاعظم' اس اعتبار سے خوش قسمت کتابیں تھیں کہ ان کی تقریبات پاکستان کے علاوہ آسٹریلیا، امریکہ اور کینیڈا کے شہروں میں ہوئیں لیکن 'صدرِمحترم' کی اشاعت کے موقع پر میرا خیال تھا کہ اب اس رسم کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو ایک اچھا پبلشر میسر ہو تو پھر مارکیٹنگ کے معاملات مصنف سے زیادہ خود پبلشر کے مفاد میں ہوتے ہیں۔ لیکن پاکستان سے باہر بیٹھ کر لکھنے والے آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل جیسے مسئلے سے دوچار رہتے ہیں۔ انہیں بار بار لوگوں کو اپنا نام یاد دلانا پڑتا ہے، کتاب کا نام بتانا اور پوچھنا پڑتا ہے کہ آپ نے کتاب پڑھی اور پھر نہ سن کر شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ کتاب کی اس طرح کی تقریبات کا

ایک فائدہ یہی ہے کہ لوگوں کو کم از کم کتاب کا نام معلوم ہو جاتا ہے اور اکابرینِ ادب تک کتاب کی رسائی ہو جاتی ہے۔

میں اکثر یہ گلا کرتا ہوں کہ ادیبوں کی برادری اپنا دروازہ ذرا مشکل سے کھولتی ہے۔ بہت زور زور سے دستک دینا اور گھنٹی بجانا پڑتی ہے۔ ان کے اپنے اَن کہے اور اَن لکھے پیمانے ہیں۔ میں شاعری کی دو کتابیں اور تین ناول لکھنے کے بعد بھی شاید ابھی تک باہر کھڑا ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں ادیب نہیں ہوں، اور دوسری یہ کہ میں ۴۵ سال پہلے صحافی کی حیثیت سے اپنی جو شناخت چھوڑ کر گیا تھا وہ اب بھی اسی طرح قائم ہے۔ میں اس عرصے میں صحافت کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتا رہا ہوں، بہت سالوں سے تحقیق سے بھی وابستہ ہوں، لیکن دوست میرے ادبی اور تحقیقی کاموں کو بھی میری صحافت کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صحافت اور تحقیق تخلیقی عمل نہیں ہیں لیکن ان سے وہ مشاہدہ، تجربہ اور حوالہ حاصل ہوتا ہے جو تخلیقی عمل میں مدد دیتا ہے۔ یہ میری اپنی رائے ہے جس سے آپ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

میں جب 'وزیرِاعظم' لکھ رہا تھا اس دوران تین وزرائے اعظم بدلے اور میری کہانی کو ہر بار نیا موڑ لینا پڑا تھا۔ 'صدرِ محترم' لکھتے ہوئے وزارتِ عظمیٰ کے پورے ادارے کی بساط ہی الٹ گئی اور شاید ابھی تک الٹی ہوئی ہے۔ اس بار مجھے کہانی کو کوئی نیا موڑ دینے کی ضرورت نہیں پڑی اس لیے کہ وزیرِاعظم کے اکثر کرداروں کے پیچھے اصلی چہرے تھے لیکن 'صدرِ محترم' کے سب کردار افسانوی ہیں۔ صدرِ محترم ایک ایسے آئیڈیلسٹ صدر کی کہانی ہے جو ایک نئے پاکستان کی بنیاد رکھتا ہے۔ لیکن اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ کچھ دوستوں کو جنہوں نے کتاب پڑھی انہیں انجام بہت خوفزدہ کرنے والا لگا۔ لیکن یہ امن کی خواہش کا اظہار ہے۔ صدر ایمان علی کے نئے پاکستان کے ملبے پر ایک نئے پائیدار اور پُرامن پاکستان کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور یہی نئی ابتدا اس ناول کا اختتام ہے۔

جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے اور جیسا کہ 'آ مرے قریب آ' میں، میں نے لکھا ہے یہ میرا رومانس ہے، میں ناول نگاری کی طرح شاعری پر بھی دعویٰ نہیں کرتا۔ شاعری کا نازک آ بگینہ دعوؤں کی سخت گیری کا متحمل ہو بھی نہیں سکتا۔ مجھے ہلکے سُروں میں گنگنانا اچھا لگتا ہے۔ 'آ مرے قریب آ' میری یہی گنگناہٹ ہے۔

یاسمین میری اہلیہ نیورو سائنٹسٹ ہیں اور mental disorders یعنی دماغی خلل پر تحقیق

کرتی ہیں لیکن ابھی تک میرے کسی ایسے دماغی خلل کی وجہ تلاش نہیں کر سکی ہیں جو کبھی گنگنانے پر اکساتا ہے اور کبھی ناول نگاری جیسی کوہ کنی پر۔

اس تقریب کا اہتمام شہناز احد نے آرٹس کونسل کے تعاون سے کیا ہے لیکن میں ان کا شکریہ ادا کروں گا تو ناراض ہو جائیں گی۔ وہ العین آئی ہوئی تھیں تو ان سے آج کی اس تقریب کے امکانات پر بات ہوئی تھی، انہوں نے اس امکان کو یقینی بنانے کے لیے جس توجہ اور سنجیدگی سے کام کیا ہے اس پر میں ان کا، شمیم عالم، مجاہد بریلوی، نثار میمن اور اکابرینِ آرٹس کونسل کا شکرگزار ہوں۔

میں امجد اسلام امجد صاحب کا بطورِ خاص شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ وہ لاہور سے بطورِ خاص اس تقریب میں شرکت کے لیے تشریف لائے اور میں ان سے دوستی کا جو دعویٰ کرتا ہوں انہوں نے اس کا بھرم رکھا۔ میرے لیے یہ بہت اعزاز کی بات ہے کہ جناب مشتاق احمد یوسفی خرابیٔ صحت کے باوجود محفل میں شریک ہوئے۔

('صدرِ محترم' اور 'آ مرے قریب آ' کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا ۲۰۰۴ء)

محبت اپنا اپنا تجربہ ہے

احمد فراز سے ایک گفتگو، ایس بی ایس ریڈیو۔ آسٹریلیا

اشرف شآد

اشرف شآد: کراچی یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دی ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بڑا اعزاز ہے، خاص طور پر شعراء کے لیے۔ فراز صاحب ہم آسٹریلیا میں بہت دور اور مرکزی رَو سے کٹے ہوئے ہیں اور شعر و ادب کے تازہ رویے ہم تک دیر میں پہنچتے ہیں۔ تو سب سے پہلے تو یہ کہ آج کل آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اور آج آپ کی شاعری کل کی شاعری سے کس حد تک مختلف ہے؟

احمد فراز: شآد! پہلے تو میں پاکستان میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری میرے لیے واقعی بہت بڑا اعزاز ہے۔ مجھے باہر کے ملکوں میں بھی اعزازات سے نوازا گیا لیکن اپنے ملک کی روکھی سوکھی باہر کے کیک پیسٹری سے بہتر ہے۔ میں کیا لکھ رہا ہوں؟ جو شروع سے لکھ رہا تھا وہی ڈگر چل رہی ہے۔ البتہ جیسے حالات ہوتے ہیں اس کا اثر ہماری نفسیات پر پڑتا ہے اور شعر بھی اس سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے رومانی چیزیں ہو جاتی تھیں لیکن جب سیاسی حالات تلخ ہو جاتے تھے تو اس کا اثر شاعری میں آ جاتا تھا۔ ملامتیں بھی ہو جاتی تھیں اور ملائمتیں بھی۔ پھر یوں ہوا کہ مارشل لاء کے زمانے میں جیسے آپ کو ملک چھوڑنا پڑا، مجھے بھی ملک چھوڑنا پڑا۔ اس زمانے کا میری شاعری کا اکثر حصہ احتجاج کی شاعری پر مشتمل ہے۔

اشرف شاد: میں آپ کے جلاوطنی کے زمانے کی بات کر رہا تھا۔

احمد فراز: میں بھی اسی حوالے سے بات کر رہا تھا۔ اُس وقت لہجے میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ وطن سے دوری بھی تھی اور لوگوں پر جو گزر رہی تھی وہ بھی تھا۔ اس طرح ملکوں ملکوں گھومتے رہے۔ ایسی نظمیں ہوتی رہیں اب جبکہ مارشل لاء ختم ہو چکا اور جمہوریت آ گئی ہے تو ظاہر ہے رویّے میں بھی اور مزاج میں بھی تھوڑی سی تبدیلی آئی ہے۔ یہ موڑ نسبتاً خوش گوار ہے۔ اسی اعتبار سے میری جو شاعری ہے اس نے پلٹا کھایا ہے اور میں اب غزلیں لکھ رہا ہوں۔ ایسی غزلیں جیسے میں دل سے باتیں کرتا ہوں چنانچہ پچھلے دنوں میرا مجموعہ 'خواب گُلِ پریشاں ہے' میں نظمیں اور غزلیں دونوں ہیں۔ لیکن موضوع کے اعتبار سے وہ رومانی زیادہ ہو گئی ہیں۔ ایک غزل میں آپ کو سناؤں گا جو بہت مشہور ہوئی ہے۔ حالانکہ نہ کسی نے گائی۔ اور نہ کسی نے سنی۔

غزل

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
تو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے درد کی گاہک ہے چشمِ ناز اُس کی
تو ہم بھی اس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اُس کو بھی ہے شعر و شاعری سے شغف
تو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے رات اسے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بامِ فلک سے اتر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے دن کو اُسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اس کو ہرن آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اُس کی سیاہ چشمگی قیامت ہے
تو اس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اُس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اُس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
تو ہم بہار پہ الزام دھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے آئینہ تمثال ہے جبیں اُس کی
جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اُس کی شبستاں سے متصل ہے بہشت
مکیں اِدھر کے بھی جلوے اُدھر کے دیکھتے ہیں

بس اِک نگاہ میں لٹتا ہے قافلہ دل کا
سو رہروانِ تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

کسے نصیب کہ بے پیرہن اسے دیکھے
کبھی کبھی درودیوار گھر کے دیکھتے ہیں

رُکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں
فراز آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

اشرف شاد: فراز صاحب واقعی آپ واپس چلے گئے۔ آپ وہ دور آہستہ آہستہ بھول رہے ہیں۔ پھر بھی یہ بتائیے کہ اس دور کی شاعری کو مجموعی طور پر آپ کیا درجہ دیتے ہیں اپنی شاعری میں۔ جیسا کہ آپ نے کہا بہرحال جمہوریت ہے۔ لگتا ہے مستحکم بھی ہے۔ اس طرح کے خطرات نہیں جیسے کہ پہلے ہوتے تھے، لیکن جو عوام کے مسائل ہیں، افلاس وغربت کا سلسلہ وہی ہے، طبقاتی کشمکش وہی ہے۔ تو کیا اب بھی نظریاتی طور پر اب ان مسائل کو کبھی کبھی touch کرتے ہیں، یا کرنا چاہتے ہیں؟

احمد فراز: اصل میں کرنا چاہیے کی بات نہیں، کرنا چاہیے، اور میں کرتا ہوں۔ کیونکہ میں جب ان مسائل کو دیکھتا ہوں تو اپنے کنٹرول میں رہتا ہی نہیں ہوں۔ چاہے میرا دوست اس وقت اقتدار میں ہو یا دشمن۔ میرا تعلق، میرا رشتہ اپنے لوگوں سے ہے، ان کے دکھ درد سے ہے۔ چنانچہ اس کانووکیشن میں جو تقریر میں نے کی اس میں، میں نے یہ کہا کہ لوگ دکھوں کے ڈھیر بن چکے ہیں دیہات محروم سے محروم تر، اور شہر مخدوش سے مخدوش تر ہو رہے ہیں۔ تو ہمیں اپنی ترجیحات متعین کرنا ہوں گی اپنی سمتوں کی حدود کی لائن کھینچنی ہوں گی کہ ہمیں جانا کدھر ہے۔ ہمارے ہاں قتل و غارت، مفلسی، جہالت، بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ، بے روزگاری، اسکولوں کی نایابی، داخلوں میں مشکلات، ہسپتالوں کے رویے یہ تمام ایسے مسائل ہیں جن سے معاشرے کا حساس شخص کٹ کر نہیں رہ سکتا تو شاعر کیسے اس سے کٹ کر رہ سکتا ہے۔ اس کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔ جب ہم جنگ کی حالت میں ہوتے ہیں تو اس وقت ہماری ذمہ داریاں اور ہوتی ہیں جس وقت ہم امن کے دور سے گزر رہے ہوتے ہیں اس وقت تعمیری فرائض ہمیں بلاتے ہیں۔ چنانچہ ایک

شاعر کی حیثیت سے جو میرا مینی فیسٹو رہا ہے، مجھے یہ ندامت نہیں کہ میں اپنی شاعری کے اعتبار سے اس مینی فیسٹو سے ہٹ گیا ہوں یا اس کو میں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ اتنا بڑا مشن ہے کہ شاید آخری سانس تک بھی پورا نہ ہو سکے۔ لیکن اس پر کام کرنا تو میرے بس میں ہے۔ اس پر جتنا لکھ سکتا ہوں لکھوں گا۔ ہاں کبھی کبھی تھوڑا سا departure اس میں ہوتا ہے کہ آپ ہر وقت ایسے مسائل پر لکھ نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ بھی اندر کی بات ہوتی ہے۔ دل سے بات نکلنی چاہیے۔ جیسے میں نے فیض صاحب سے پوچھا تھا کہ آپ کیوں ترجمہ کرتے ہیں۔ آپ ایک مصرعہ کہہ دیتے ہیں تو کراچی سے لے کر لنڈی کوتل تک پہنچ جاتا ہے پھر آپ کو اقبال یا دوسروں کے ترجمے کی کیا ضرورت ہے یہ کام تو دوسرے لوگ اور ممکن ہے بعض مترجم بہتر کر لیں۔ فیض صاحب نے کہا کبھی تم پہ بیرن پیریڈ Barren Period نہیں آیا۔ میں نے کہا جی بالکل آیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کبھی شعر کہا ہی نہیں۔ کہنے لگے اس زمانے میں تم کیا کرتے ہو۔ میں نے مذاق سے کہا عشق وشق کرتے ہیں یا کتابیں پڑھتے ہیں۔ کہنے لگے حرف سے رشتہ توڑنا نہیں چاہیے۔ اگر اس وقت تخلیق نہیں کر سکتے تو کوئی اس سلسلے کا کام کریں تاکہ حرف سے آپ کا رابطہ رہے اسی اعتبار سے یہ رابطے کی بات میں نے گرہ میں باندھی ہوئی ہے۔ زندگی کے کافی زمانے ہو گئے شعر کہتے ہوئے میرا خیال ہے کہ اس میں یہ دونوں طرح کے رنگ جھلکتے رہے ہیں۔ اس سے نہ میرے پڑھنے والے پریشان ہیں نہ میں پشیمان ہوں۔

اشرف شاد: یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ جو اصلی مسائل ہیں ان کا آپ کو اتنا گہرا احساس ہے۔ یہ بتایئے ہمارے شعری و ادبی مسائل کیا ہیں؟

احمد فراز: اصل میں شعری و ادبی مسائل کچھ نہیں ہیں۔ انسانی مسائل سے ان کا گہرا رشتہ ہے اور ہونا چاہیے۔ ایک جدید شاعر کی حیثیت سے۔ اس سے مطلب ترقی پسند شاعر یا ادیب سمجھتا ہوں۔ یہ کوئی دو چیزیں نہیں ہیں۔ ہم نے خانے بنا رکھے ہیں۔ لکھنے والے میں احساس، علم، تجربہ اور لکھنے کا ٹیلنٹ ہے تو اسے کسی فارمولے کو فالو کرنے

کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خود ضمیر اس کو بتاتا ہے کہ کیا لکھنا چاہیے۔ اب نیرو کی طرح، روم جل رہا ہو تو میں بانسری نہیں بجا سکتا۔ ہمارے ادب میں شروع سے بلکہ تقسیم کے بعد سے جو رویے آئے ہیں ان میں کچھ ایسی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔ جو لوگ Diversion چاہتے ہیں وہ ہیئت کی طرف چلے جاتے ہیں یا تیتر بٹیر، مینڈک پر نظمیں لکھتے تھے۔ لیکن ایک باشعور اور باضمیر شاعر بنیادی رویوں سے Departure اختیار نہیں کر سکتا۔ اب جیسے ہمارے یہاں کچھ لوگ اسی میں گم ہیں تین مصرعے ہونے چاہئیں یا چار مصرعے ہونے چاہئیں۔ ایک غزل ساری مطلعوں میں ہونی چاہیے۔ یا نثری نظم کا پچھلے دنوں کچھ رواج چلا اس میں سہل نگاری اور Incompetence (نااہلی) کے علاوہ کچھ درجہ نہیں دیتا۔ جو لوگ ردھم، اوزان کا فرق نہیں جان سکتے وہ ان تمام چیزوں سے جان چھڑا کر سیدھے سادے سے جملے کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر کے نظم لکھتے ہیں۔

اشرف شاد: فرازؔ صاحب آپ کے ساتھ ایک زیادتی مسلسل کی جاتی ہے۔ مثلاً آپ کی اپنی شناخت اپنا لہجہ ہے لیکن فیض صاحب کے ساتھ اکثر آپ کا نام جوڑا جاتا ہے۔ آپ کو ان کا جانشین بھی کہا جاتا ہے۔ تو کیا اس کی وجہ آپ دونوں کی شاعری میں جو ایک نظریاتی ہم آہنگی ہے وہ ہے یا یہ ہمارا عام سیاسی اور ادبی رویہ ہے جانشینی کا۔

احمد فرازؔ: پہلے تو میں جانشینی کا قائل نہیں ہوں یہ میراث نہیں کہ دست بدست سلطنت کی طرح آئے۔ فیض صاحب ہمارے سینئر شاعر تھے اور اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے میں نے ان سے سیکھا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سے بھی سیکھا۔ ناصر صاحب سے سیکھا...... لیکن فیض کا نام یوں لیا جاتا ہے کہ میں نے فیض صاحب کی زمین میں جیسے 'لا کے رکھو سرِ بالیں کوئی خورشید اب کے' ان کا ایک ہی شعر تھا۔ ہم نے اس پر پوری غزل لکھی۔ فیض صاحب نے غزل بعد میں کہی۔ یہی نہیں انہوں نے میری غزل پر ایک غزل بعد میں کہی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ سینئر اور میں جونیئر تھا لیکن ہم عصر تھے۔ ہمارے حالات ایک تھے۔ ایک سے واقعات پیش آ رہے ہوں تو اپنے عہد کے بزرگوں سے آدمی متاثر ہوتا ہے۔ میں بھی ایک حد تک ہوا۔ لیکن

میری غزل، میری نظم اس کے موضوعات چند تو مشترک ہو سکتے ہیں جیسے ویت نام، بیروت، فلسطین کی جنگِ آزادی اور اپنا ملک۔ لیکن اکثر و بیشتر میری غزلیں، نظمیں، میرے موضوعات، بہت سی ردیفیں، زمینیں اور غزلوں کے تجربے میرے اپنے ہیں۔

اشرف شاد: فراز صاحب! آپ باہر کافی جاتے ہیں۔ آپ کی شاعری بھی باہر پہنچی ہے خاص طور پر جلاوطنی کے دور میں۔ آسٹریلیا کو آپ نے محروم رکھا ہے لیکن ہم کمی پوری کریں گے۔ لیکن باہر بھی کافی لکھنے والے ہیں۔ باہر بھی کافی شاعری ہو رہی ہے حالانکہ وہ مرکزی رَو سے کٹی ہوتی ہے۔ لیکن ان کی شاعری کو آپ کس حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اس میں کچھ فرق ہے کچھ تازگی ہے؟

احمد فراز: میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ہمارے بعض شعراء جو ہمارے باہر کے ممالک میں شاعری کی شمعیں جلائے ہوئے ہیں وہ کئی اعتبار سے یہاں کے ہمارے شعراء سے بہتر شاعر ہیں۔ نام میں کس کس کے گناؤں۔ مثلاً اشفاق حسین، عابد، نزہت صدیقی، صبیحہ صبا، اخگر، ضیاء، حمیرا رحمٰن اور نسیم سیّد بہت اچھی نظمیں کہہ رہی ہیں۔ بہت سے لوگ جو اچھی شاعری کر رہے ہیں میں سمجھتا ہوں ان کے تجربے بھی اپنے ہیں اور اندازِ بیان بھی اپنا ہے۔ یہ سب لوگ اچھی نظمیں اور غزلیں کہہ رہے ہیں جن کے حوالے وہیں سے بنتے ہیں۔ اس اعتبار سے اردو شاعری میں بوقلمونی پیدا ہو رہی ہے اور یہ نیا خون ہے جو اس میں آنا چاہیے۔ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرنی چاہیے۔

اشرف شاد: فراز صاحب۔ ہمارے یہاں جو عوام تک پہنچنے کا مسئلہ ہے۔ مثلاً ایک تو غزلیں گائی جاتی ہیں۔ اخباروں کے ادبی ایڈیشن نکلتے ہیں۔ ادبی رسالے بہت کم ہیں البتہ مشاعرہ بھی ایسا ذریعہ ہے جس کے ذریعے آپ عوامی سطح پر پہنچ پاتے ہیں۔ تو یہ بتائیے کہ مشاعرے کی روایت ہمارے یہاں مضبوط ہو رہی ہے یا اس میں کمی واقع ہوئی ہے۔

احمد فراز: میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ مشاعرہ نہ صرف یہ کہ ہمارا ثقافتی ورثہ ہے بلکہ عوامی سطح پر بہت مقبول ہے۔ میری جلاوطنی کا ایک سبب یہی تھا کہ جب میں نے کراچی کے

ایک مشاعرے میں اپنی نظمیں پڑھیں تو رات میں پولیس مجھے 'سندھ بدر' کرنے آ گئی۔ اور جب وہ مجھے جہاز میں بٹھا کر لے جا رہے تھے تو مجھے خیال آ رہا تھا کہ عوام سے رابطے کا یہ میرا صرف ایک ہی ذریعہ تھا۔ ہمارے ایک سویڈن کے دوست ہیں، جب میں ان سے کہتا ہوں ہمارے مشاعرے میں پچاس ساٹھ ہزار لوگ آتے ہیں تو انہیں یقین نہیں آتا۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کے کسی بھی علاقے میں مشاعرہ ہو اور اس میں اگر دو ہزار بھی لوگ ہوں تو مجھے بلا لیں۔ تو واقعی مشاعرے میں لوگوں کو نہ صرف تفریح ملتی ہے بلکہ ملکی موضوعات پر جو نظمیں ہوتی ہیں ان پر سوچنے کا یہ ایک Indirect طریقہ ہوتا ہے۔ مشاعرے کے Institution کو Discourage نہیں کرنا چاہیے۔ ان حالات میں کراچی میں (ہنگاموں کے دور میں) مشاعرہ تھا تو اس میں بیس تیس ہزار لوگ جمع تھے۔ ہم چاہتے تھے کراچی میں موسیقی کی محفلیں ہوں، ڈرامے ہوں، مشاعرے ہوں تاکہ لوگوں کی توجہ بندوق، چرس، افیون اور حشیش سے Divert کی جا سکے۔

اشرف شاؔد: آخیر میں ایک سوال اور ہے، آپ نے فیض صاحب سے عشق کا ذکر کیا تھا۔ تو یہ عشق کا سلسلہ آج بھی جاری ہے یا آپ نے تعطیلات کے لیے اٹھا رکھا ہوا ہے؟

احمد فراؔز: میں ہمیشہ رومانٹک گرپ میں رہتا ہوں اور جب تک رومانٹک فلیور نہ ہو اس کے بغیر شاعری کرنا ایسی ہی بات ہے جیسے عشق کوئی اور کرے اور نوحہ گری میں کروں۔ پرانے زمانے میں تو یہ ممکن تھا لیکن اب نہیں ہے۔ جیسے میں نے کہا 'محبت اپنا اپنا تجربہ ہے۔ یہاں فرہاد و مجنوں معتبر نہیں' یہاں خود سب کچھ محسوس کرنا ضروری ہے۔ پھر وہ لگن، وہ آگ، وہ جذبہ، وہ رونا، وہ آنسو، وہ جدائی کی بے قراری، قربت کا نشہ۔ اب اُس سے آپ جب تک خود نہیں گزریں گے تو آپ شعر تو کیا لکھیں گے، زندہ نہیں رہ سکتے۔

اشرف شاؔد: چلیے۔ اپنے نئے یا پرانے کچھ پسندیدہ اشعار سنا دیجیے۔

احمد فراؔز: پرانے کیا سنائیں آپ کو۔ نئے سناتے ہیں۔ پچھلے دنوں یہ غزل کہی تھی۔ مطلع میں پروین شاکر کے انتقال کا تھوڑا سا پرتو ہے۔ باقی اور مزاج کی ہے۔

غزل

کل نالۂ قمری کی صدا تک نہیں آئی
کیا ماتمِ گل تھا کہ صبا تک نہیں آئی

آدابِ خرابات کا کیا ذکر یہاں تو
رندوں کو بہکنے کی ادا تک نہیں آتی

تم ایسے مسیحا کہ تغافل کا گلہ کیا
ہم جیسوں کی پرسش کو قضا تک نہیں آتی

بے صرفہ چراغوں کی طرح جلتے رہے ہم
تُو کیا تیرے کوچے کی ہوا تک نہیں آئی

کس جادہ سے گزرا ہے مگر قافلۂ عمر
آوازِ سگاں بانگِ درا تک نہیں آئی

(اسلام آباد ۱۹۹۲ء)

Ashraf Shad launches his new novel "Wazer-e-Azam (Prime Minister)"

Sydney (Tribune Report): The renowned Pakistani Urdu Writer and the Producer of Urdu Programme on SBS Radio, Sydney launched his new novel "Wazer-e-Azam" means "Prime Minister" in a ceremony held at SBS Atrium, SBS Radio building in Artarmon on Saturday the 2nd September. This is Ashraf's second novel after *Bewataan*, launched in 1997. The head of SBS Radio Mr. Quang Luu, Consul General of Pakistan Raza Baqar and other prominent figures of SBS and from the ethnic communities also attended the ceremony.

The new novel "Wazer-e-Azam" is about a story where President wants to sack the Prime Minister to take powers in his own hands. Story evolves around four politicians aspiring to become prime minister, each one supported by present and ex-army generals, bureaucrat and by a power mafia.

All characters are fictional and easily recognisable as the major players of Pakistani politics.

Ashraf Shad's friends invited Sydney community to his book launch 'Wazeer-e-Azam'(English) and 'Bewatan' (Hindi) at SBS headquarters at Artarmon. Ashraf received accolades and praises for his works from the guests which included Mr. Nigel Milan, Managing Director, SBS andcommunity members. Mr Milan appreciated Ashraf's effort saying that it would need a great skill and patience to coherently put together stories and make it into a novel. Kumud Merani spoke about Ashraf's honing of the art, his inborn talent. In the picture are: Ashraf (extreme right), his wife Yasmin, daughter Saman, Mr Quang Luu, head SBS Radio (third from left) and Mr Nigel Milan (with Ashraf Shad).

Kumad Mirani

The Urdu literati of Australia were taken not by the proverbial storm but refreshed with the gust of scented breeze that Ashraf brought with him to Australia. He has left behind him a trail of journalistic excellence is Pakistan, Kuwait and Bahrain. Shad has circumnavigated around the entire coast of journalistic writing, which in his case stretches from *political journalistic writing*, which in his case stretches from political journalism, to novel writing, to *ghazals* and has come round full circle in a successful career to culminate in stimulating and meaningful broadcasting. He presently holds the position of head of Urdu service at the SBS service at the SBS Radio Asutralia. His personal achievements have never stopped him from appreciating other poets and poetic from. He is one who treats friendship as a bond of caring and sharing rather than as an opportunity. It has been my good fortune to know Ashraf as a good friend and wrothy colleague.

** **Kumud Mirani** is head of Hindi service of the SBS Radio Sydney.*

Ashraf Shad launches his new novel "Wazer-e-Azam (Prime Minister)"

Sydney (Tribune Report): The renowned Pakistani Urdu Writer and the Producer of Urdu Programme on SBS Radio, Sydney launched his new novel "Wazer-e-Azam" means "Prime Minister" in a ceremony held at SBS Atrium, SBS Radio building in Artarmon on Saturday the 2nd September. This is Ashraf's second novel after Bewatan, launched in 1997. The head of SBS Radio Mr. Quang Luu, Consul General of Pakistan Raza Baqar and other prominent figures of SBS and from the ethnic communities also attended the ceremony.

The new novel "Wazer-e-Azam" is about a story where President wants to sack the Prime Minister to take powers in his own hands. Story evolves around four politicians aspiring to become prime minister each one supported by present and ex-army generals, bureaucrat and by a power mafia.

All characters are fictional and easily recognizable as the major players of Pakistani politics.

Ashraf Shad's friends invited Sydney community to his book launch 'Wazeer-e-Azam'(English) and 'Bewatan' (Hindi) at SBS headquarters at Artarmon. Ashraf received accolades and praises for his works from the guests which included Mr. Nigel Milan, Managing Director, SBS andcommunity members. Mr Milan appreciated Ashraf's effort saying that it would need a great skill and patience to coherently put together stories and make it into a novel. Kumud Merani spoke about Ashraf's honing of the art, his inborn talent. In the picture are: Ashraf (extreme right), his wife Yasmin, daughter Saman, Mr Quang Luu, head SBS Radio (third from left) and Mr Nigel Milan (with Ashraf Shad).

Kumad Mirani

The Urdu literati of Australia were taken not by the proverbial storm but refreshed with the gust of scented breeze that Ashraf brought with him to Australia. He has left behind him a trail of journalistic excellence is Pakistan, Kuwait and Bahrain. Shad has circumnavigated around the entire coast of journalistic writing, which in his case stretches from *political journalistic writing*, which in his case stretches from political journalism, to novel writing, to *ghazals* and has come round full circle in a successful career to culminate in stimulating and meaningful broadcasting. He presently holds the position of head of Urdu service at the SBS service at the SBS Radio Asutralia. His personal achievements have never stopped him from appreciating other poets and poetic from. He is one who treats friendship as a bond of caring and sharing rather than as an opportunity. It has been my good fortune to know Ashraf as a good friend and wrothy colleague.

** **Kumud Mirani** is head of Hindi service of the SBS Radio Sydney.*

"بے وطن"
وزیر اعظم ادبی ایوارڈ
۱۶ نومبر ۱۹۹۸ء
Arts Council

भटकते बेवतनों की हालत का जायज़ा

نئی دہلی
بے وطن (ہندی)
۱۴ مئی ۲۰۰۰ء

अप्रवासियों के लिए एक सबक है शाद का उपन्यास 'बेवतन'

जीवन की सच...

पाकिस्तानी लेखक

अमर उजाला

Book *The Honorable President* ready for publication, author Shad says

By a Staff Writer

TORONTO – Ashraf Shad, an award-winning Pakistani writer and veteran journalist, is compiling yet another novel – *Sadr-e-Mohtarim* (The Honorable President).

Plans for the publication of his new book were announced by Shad himself at a literary evening organized by Mr. Jamal Zuberi in cooperation of Urdu International Canada here at Holiday Inn Richess Restaurant. Speaking on the occasion he said that *Sadr-e-Mohtarim* will be another political fiction based on several true stories concerning the role played by various elected and non-elected presidents of Pakistan. He said the novel will be released very shortly. Ashraf Shad, who arrived here from Australia recently to attend an international Urdu *Mushaira*, said that plans are also under way to write another novel entitled – My Lord. He said this book will through light on the role of Pakistani judges of high courts and Supreme Court.

Ashraf Shad

Shad, who is currently associated with Sydney Radio (Urdu service), said that being a working journalist he was an eye witness to several debatable decisions taken by politicians, military rulers and judges. "I want to convey my feelings and observations about those decisions through imaginary characters of my novels," he said.

Ashraf Shad's first novel, – *Bewatan* (The Expatriate) had won the Pakistan Prime Minister's award in 1997.

A view of a Mushaira organized by Urdu International, Canada.

Bewatan has recently been translated into Hindi in New Delhi. Shad's second 574-page novel *Wazeer-e-Azam* (The • Prime Minister) was well read in political and Urdu literary circles of Pakistan, India, Europe and North America.

Dr. Qasim Pirzada, a noted Urdu poet of Pakistan, who presided over the literary evening, greatly commended the creative writing work of Ashraf Shad. He said he knew Shad from his college days. As a logue with everyone and on all issues. This approach made him a successful journalist, a reputable broadcaster and a great fiction writer. Dr. Pirzada stressed the need of dialogue and said: "Silence should not be our mother tongue."

Mr. Qamar Sadiq, the Chairman of the Multi-cultural Society of Pakistani Canadians (MSPC) presented awards on behalf of his Society to Shad, Pirzada and Ms. Zakia Ghazal, an Urdu poet of Karachi and Zubair Rizvi who

"وزیر اعظم" زندہ باد!

جس جس نے پڑھا اس نے یہی کہا کہ اشرف شاد کا ناول "وزیر اعظم" عبداللہ حسن کے "اداس نسلیں" اور تہمینہ درانی کے ناول "مینڈا سائیں" سے بھی زیادہ فروخت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

شہر اقتدار

ضمیر نفیس

EXTERNAL LINKS

- http://www.sadaewatansydney.com/ashrafshadoct2011.htm
- http://www.sadaewatansydney.com/faizsahib5march2011syd.htm
- http://www.sadaewatansydney.com/bhaiashrafshadcoming24feb.htm
- http://www.archives.dawn.com/2005/05/08/local13.htm
- http://www.urdumanzil.com/directory/index.html
- http://www.acad.gov.ae/venglish/detailnewspage.jsp?articleID
- http://www.goodreads.com/author/show/1059972.Ashraf_Shad
- http://www.sadaewatansydney.com/ashrafsydneyagain.htm
- http://www.sadaewatansydney.com/ashraf_shad_is_in_australia.htm
- http://www.sadaewatansydney.com/rehanteaparty.htm
- http://www.linkedin.com/pub/ashraf-shad/10/77/794
- http://www.forum.pakistanidefence.com/?showtopic=9822
- http://adabialbum07.tripod.com/id11.html
- http://www.linkedin.com/pub/dr-kaneez-fatima-shad/15/29b/456
- http://en.wikipedia.org/wiki/Saman_Shad

POETRY SUNG ON PTV

http://www.youtube.com/watch?v=jSBmWBaD9xg
http://www.youtube.com/watch?v=Vi89rOVrFY4
http://www.youtube.com/watch?v=VDI0cLzdLxs
http://www.youtube.com/watch?v=H0CQjXkDrOg
http://www.youtube.com/watch?v=-suo-oSu_Kw
http://www.youtube.com/watch?v=z3j0f66C34E

IMPRISONMENTS

He has a long record of skirmishes with the government in Pakistan, first as a student and then as a journalist. He was detained briefly during students demonstration against the second Pakistani President, Field Marshal Ayub Khan. In 1970 he participated in a nation-wide journalists' strike during the Martial Law government of the third president, General Yahya Khan, and was among journalists who were sacked and black-listed for jobs in major newspapers.

In 1973, during the government of Zulfikar Ali Bhutto, he was arrested for violating a government ban on public gathering. He was protesting against new press laws and had to spend three weeks in Lahore Camp Jail. He was arrested again in 1978 during the government of Zia-ul-Haq under Martial Law Order 12 (MLO 12) for his reporting and participation in a journalists' movement for the freedom of the press. He spent three months in Karachi and Hyderabad jails. He went into self-exile in New York in 1980 after he was indicted in a more serious case under the Official Secrets Act for publishing government documents marked "Top Secret". After three years in New York he moved to Bahrain to join his family.

FAMILY

He is married to Kaneez Fatima-Shad, an academic and a neuroscientist known for her work on brain disorders who is currently a professor in the University of Brunei Darussalam. She is also a poet and short story writer. He has a daughter and two sons. His daughter spends time between London and Sydney and is a playwright and novelist. Both of his sons live in Sydney. Arsalan is a banker and a songwriter and Salman studied acting and is a professional stage actor.

PUBLICATIONS

Problems of Reporting the Developing World: A case study of New York Time's reporting on China (1992).
Nisab, a collection of poetry (1996).
Bewatan, a novel that won an award for the best novel in Pakistan (1997).
Wazir-e-Azam, (The Prime Minister), political fiction (1999).
Bewatan, a Hindi translation published in India (2001).
Shora-e-Australia (Urdu Poets of Australia), a compilation (2001).
Aa Merey Qareeb Aa (Come close to me), a collection of poetry, (2003).
Sadre Mohtaram, (The President) (2004).
Peeli Lakeer (The yellow line), a collection of short stories (2011).

AWARDS

- 1998: Prime Minister Literary Award from Pakistan Academy of Letters for best novel
- 1999: Award by the Urdu Society of Australia for literary and journalistic contributions
- 2005: Australian Award for contribution to Australian Multiculturalism by FECCA

From: Wikipedia, the free encyclopedia
http://en.wikipedia.org/wiki/Ashraf_Shad

ASHRAF SHAD

Ashraf Shad, an Australian of Pakistani origin, is a writer/journalist in the Urdu language, an award winning novelist and a poet. He was the head of the Urdu language program of SBS Radio Sydney, the Australian public broadcaster, and worked for major newspapers in Pakistan, Bahrain and Kuwait before migrating to Australia. His novel Bewatan won the Prime Minister Literary Award in 1998 for the best novel from the Pakistan Academy of Letters.

BIOGRAPHY

Ashraf was born in 1946 into a Mogul family in Moradabad, a city of Uttar Pradesh (UP), India. His ancestors were from the Javanshir tribe of Azerbaijan and came to India in the nineteenth century with the invading Muslim army. After the partition of India his family moved to Karachi, the first capital of Pakistan.

His published work includes three novels, three books of poetry, a collection of short stories (all in Urdu) and a research work (in English) on the US press coverage of the developing world. Ashraf is credited with exposing the brutal Pakistani establishment in his novels. According to Ahmed Nadeem Qasmi, an Urdu writer and poet, "Ashraf Shad reinvigorated the tradition of creating literature by making bold use of political material." Jagan Nath Azad, a literary critic and poet, considers Ashraf a modern poet of distinction, saying that "the diction of his poetry comes from the past and the present then travels far into the future".

EDUCATION

He studied at the Urdu College of Karachi University, but left his law degree uncompleted in order to become a journalist. He gained a diploma in journalism from an institute in Budapest, Hungary, and earned his Master's degree from the University of New South Wales in Australia.

CAREER

He worked his way up from a trainee journalist in 1967 to the Executive Editor of a political weekly in 1976. He later lived in New York working with left-wing groups and human rights organizations. He moved to Bahrain in 1983 and joined the local weekly Gulf Mirror and worked there until the paper closed in 1986. He joined Daily Arab Times in Kuwait as the Editor of its Urdu section and remained there until 1989 when he migrated to Australia with his family. In Sydney he joined the SBS Radio as an Executive Producer and head of the Urdu program. He was also the Australian correspondent for the Pakistani English daily, Dawn, and for the Indian news agency, UNI. He took early retirement from the SBS to join the UAE University in Al Ain, United Arab Emirates, as an Academic Editor as well as the Editor of the University magazine, Research Affairs. He also taught media courses in SZABIST, another university in Dubai. He left UAE in 2011 and moved to Brunei where he works as a freelance journalist.

me. Like an oasis while traveling in a long vast desert. Last year I published the second collection of my poetry 'Aa Merey Qareeb Aa' (Come close to me). You will find all my new ghazals in this collection along with some topical poems and a selection of my more famous pieces from my earlier book of poetry, Nisab. But these days poetry is one of my neglected children as I am focusing more on writing films.

Q: What about your career as a journalist?

Ashraf:
Journalism is my first love and is also reflected in my other writings even in my poetry. Though I am on long leave from SBS (the Australian Radio) for my current assignment at the UAE University as the Academic Editor, I still report for the Radio about the current Middle East situation or Indo-Pak relations. I also cover UAE for Dawn, the most credible Pakistani daily and occasionally write for an Indian news agency. (2005)

Neena Badhwar is the Editor/Publisher of Sydney based Indian Downunder, the oldest Indian newspaper in Australia

---

exchange of visits between peace activists and film artists will not bring a durable peace. This 'Qawwali' starts every time peace efforts start and dies down after the peace move hits the cold storage. It may be true that old wounds have healed or sealed with the emergence of a post-partition generation, but Kargil opened new wounds and Kashmir is still bleeding.

I think we will have to change our perceptions about each other. It's not easy; it's multidirectional and has many dimentions. It requires cross-cultural and cross-religious understanding likes how a Pakistani Muslim perceives an Indian Hindu and vice versa. Patriotism has also to be redefined as a positive emotion and not a negative rhetoric to flesh out hate. This has to be done at a grass root level while the establishments, on both sides, will have to develop partnerships instead of rivalries as a prelude to confidence building.

So you see it's not a simple, easy and a short-term process. I think one has to be optimistic about the success of the process as both have no option but to walk on a peace path I am sure that external pressures and domestic imperatives will force both parties to keep on the track and not to derail the current peace efforts.

Q: What are your views on terrorism and what do the people in UAE say about the American invasion? Could you elaborate on the labeling of whole Muslim community and the problems they are coming across in their day to day lives?

Ashraf:
Who can have a different view on terrorism than terrorists themselves? I was recently working with an Egyptian professor on two papers to be presented in two international conferences in Spain and Brazil and both papers argued that there's no place for terrorism in Islam. Terrorism cannot be confused with fight for freedom. The world has come a long way after the Second World War when people were fighting with their colonial masters for freedom. That phase of history is over after colonial rules crumbled like a domino. The Vietnam War was the last such event recorded in history.
Look at the world now. nobody is close to win freedom or autonomy or whatever they are fighting for by using terror as a weapon. Look at the Tamil Tigers in Sri Lanka, IRA in Ireland, Basques in Spain, Chechens in Russia, Kurds in Iraq, Turkey, Iran and Syria, and Mindanao separatists in the Philippine and so on. Even Palestinians, whose right to statehood and freedom is universally acknowledged and who are fighting brave battles to win freedom, are dependent on a roadmap given by the USA. The terrorism has only resulted into state terrorism by power that be and has led to direct and indirect occupation of countries like Afghanistan and Iraq.

Q: What about your poetry?

Ashraf:
Poetry has always been like a mental solace for

there was no way to find out as the Prime Minister was deposed only few months after the novel was published and Wazir-e-Azam had a free ride in the absence of a Prime Minister in Pakistan for the next three years.

Sadr-e-Mohtaram is a very hard hitting novel but it is too early to say how Pakistani establishment will react to it. It has just been released and books have a slow pace to reach the right or wrong circles. But it doesn't matter. I write fearlessly and have never cared about the reaction of whomever.

Perhaps you know my background. Now I live outside Pakistan as an Australian citizen, but even during the years when I lived in Pakistan and worked as a journalist under a very harsh Martial Law Government, I never compromised on my right to express my views. I was jailed, my publications closed down, faced court cases and had to go into self-exile, but could never change myself.

Q: And the reaction in India and overseas?

Ashraf:
In India, unfortunately, except for Bewatan, no other book could be translated or published. Bewatan was 'transliterated', I mean transcribed in Hindi, with footnotes. I know you have some reservation about this transliteration and I really want to translate my other novels in Hindi not to just transcribe it. I will see the possibilities when I go to India next time.

In other countries, both my Urdu books got a good exposure and launching ceremonies were held in New York, Los Angles, and Toronto and also in Sydney, Melbourne and all the major cities in Pakistan. The feedback has been good but a major problem is the availability of books overseas. Even in Australia where I live, my books couldn't be available to those who want to read it.

Q: What are your comments on the recent thawing of Indo-Pak relations?

Ashraf:
I see hope, but at the same time I like to be cautious about the hype and premature optimism shown by people. This optimism is the result of a strong desire for peace by people on both sides who met with disappointment every time a peace process started. The current peace initiative is not a new phenomenon and has happened many times before. Look into the history: Shastari/Ayub Khan; Indra/Bhutto; Zia's cricket diplomacy; Rajiv/Benazir; Vajpayee/Nawaz; Vajpayee/Pervez; and now the Manmohan/Pervez. All previous flirtations have been short lived. The strong mutual understanding and confidence-building measures are needed for the success of any peace move.

Q: How can we bring these successful measures?

Ashraf:
It's not an easy process. A cricket series and the

Q: Isn't opposite to what's actually happening between India and Pakistan?

Actually it's not a simple thing to explain as every event in the novel is cast somewhat realistically, backed up by some facts and logics. But a nuclear war is not just the end of the novel. The ending is actually the beginning of a new era of a lasting and durable peace, the emergence of a new and a nuclear-free world in South Asia.

I know it's a horrible scenario but I want people to know the horror of a nuclear war. When we possess atomic arsenal, the possibilities of their use cannot be out rightly dismissed. Missiles are still being tested and are placed to target each other. War is a devastating thing and those who have their fingers on the trigger have a different frame of mind. They do crazy things in a spur of the moment. And that's what I have shown in this novel.

Q: Besides the high powered politics, does the novel include common people?

Ashraf:

The novel has every ingredient of a popular novel. There are many common and un-common characters starting with two professors, arguing the partition theory at the India Gate. There is a Sydney girl runs away from a sham marriage and returns to Pakistan to work as the tour guide. Mostly, the characters are living in Pakistan, the USA and Brazil. Two main characters, who work as a link in the story, are a PhD and a medical student in New York who love each other but circumstances don't allow them to express their feelings. Also there is a Turkish girl living in New York who wants to be a suicide bomber; a doctor who plays musical chair with his four wives and runs away from them, one after another, from Karachi to New York, to Columbia and then re-emerges in Rio-de-Janeiro as a Sadhu.

There is a schizophrenic arms smuggler who can predict future; a bureaucrat, son of a poor farmer, who thinks he would be the next Prime Minister; a feudal Lord who wants to be the President by using his wife as his lucky charm. There is a New York peace activist who leaves his father's million dollar penthouse to live with his street-lawyer girlfriend in a tiny flat; an editor who exposes a corrupt ambassador; a homosexual fashion designer and her surgeon father who wants to resettle in Pakistan. There are many other important characters that could make this list very long.

Q: How's the reaction been in Pakistan, don't you have any fear?

When I came to Pakistan to launch Wazir-e-Azam in 1999, I was interviewed by the government-owned Pakistan Television. I told the producer not to interview as I have written some nasty things about the then Prime Minister. He laughed and went on with the interview saying nobody in the government has time to read books.

He may be right but

Interview with Indian Downunder, Sydney

The fearless Shad hits hard again

'Patriotism has to be redefined as a positive emotion', says the writer of Sadr-e-Mohtaram

By Neena Badhwar

The restless writer of 'Bewatan' and 'Wazeer-e-Azam', Ashraf Shad, who now resides in the UAE, has come up with another novel 'Sadr-e-Mohtaram'. One can only imagine where he would be while penning the book - in a university, most probably in a cafe, where the noise of young students going past makes Shad occasionally looks from the sheaths of papers as he weaves another magic tale, as the master in the art of description. Here we get in touch with him to find out a bit about his work and his views from the Middle East.

Q: What's the novel Sadr-e-Mohtaram about?

Ashraf:
Sadr-e- Mohtaram (The President) is actually the follow-up of my earlier novel Wazeer-e- Azam that was published in 1999 and was a caricature of politicians and a portrayal of the personalised nature of Pakistani politics. It was a critical review of power politics in Pakistan in a fictional form and posed questions without giving many answers.

In my new novel I have tried to provide some answers and some solutions.

The plot of the novel revolves around an idealist President who comes to power with the help of a reformed Power Mafia and an equally idealist Chief of Army and starts building a New Pakistan. The President turns the President House into a museum of political history while he lives in a small house and works in a modest office where he receives all foreign dignitaries.

He vigorously pursues reforms in all sectors of the society, the feudalism, military and political establishments, bureaucracy and fundamentalism. In three years he rebuilds all major institutions but when the new army chief takes over, skirmish starts on the borders which lead to the danger of a full fledged war. It was revealed that the USA was encouraging both Indian and Pakistani generals to bring them head to head for a nuclear war. The President comes to know at the last minute about the American agenda and strategy to implements its plans but then it was too late to stop the catastrophe. Nuclear bombs explode and Hiroshima recreated in South-Asia.